ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

MARCH 1989

ماہنامہ رفیقِ منزل دہلی کی خصوصی پیش کش

ہندوستانی سماج اور دعوتِ اسلامی

- معلومات افزا مضامین سے بھرپور ایک دستاویزی نمبر
- کارکنانِ تحریک، خصوصاً طلبہ اور عام افراد کے لئے یکساں مفید
- چار رنگوں میں جاذبِ نظر ٹائٹل کے ساتھ

اپریل ۸۹ء میں منظرِ عام پر آرہا ہے

صفحات: ۱۶۴ • قیمت: ۸ روپے

سالانہ خریداروں کو یہ نمبر مفت دیا جائے گا

سالانہ زرِ تعاون — ۳۰ روپے

ایجنٹ حضرات اپنی مطلوبہ تعداد اور مشتہرین اپنے اشتہارات جلد روانہ کریں

ماہنامہ رفیقِ منزل، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی ۲۵

فون نمبر ۶۸۴۶۵۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

جلد نمبر ۳ — شمارہ نمبر ۳

مارچ ۱۹۸۹ء

- مدیر مسئول — نور محمد فدائی
- مرتب — مولانا حیدر سعیدی فدائی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

- سالانہ زرِ تعاون .... ۳۰ روپئے
- خصوصی تعاون .... ۱۰۰ روپئے
- غیر ممالک سے .... ۵ امریکی ڈالر
- فی شمارہ .... ۳ روپئے

ترسیلِ زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ مجلہ "حیاتِ نو" جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی ۲۷۶۱۲۱

افضل نعیمی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی

نقوشِ حیاتِ نو

اداریہ

وہ بھی تو عربی مدرسہ کا فارغ تھا	محمد اسمٰعیل فلاحی	۳

بحث و نظر

و ہٰذا عیدنا	صباح الدین ملک	۴
قدامت پرستی کا کیسا جنون ہے یہ؟!	ڈاکٹر محمد عنایت اللہ سبحانی	۲۲
قصائد جاہلی اور مسئلہ تعلیق	مسیح الزماں فلاحی	۴۸

عظمت کے مینار

حضرت عبداللہ بن ام مکتوم	ڈاکٹر عبدالرحمن رافت پاشا	۱۶
دورِ جدید کے مسائل اور ان کا حل	شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز۔ عبدالرزاق عفیفی۔ عبداللہ بن قعود عبداللہ بن غدیان	۴۴

تعارف و تبصرہ

"نماز ایک معجزہ"	نعیم الدین اصلاحی	۵۷

شعر و نغمہ

نعتِ سرورِ کائنات ﷺ	محمد عمر الدین قمر	۴۲
غزل	فائق انصاری۔	

جامعہ کے لیل و نہار

فارغات کو نصیحتیں۔ اس بار بھی شیلڈ جامعہ میں		۶۰

محمد اسمٰعیل فلاحی

وہ بھی تو عربی مدرسہ کا فارغ تھا

۱۴۸۶ء میں وہ سہسرام کے ایک گھرانے میں پیدا ہوا۔ یتیم تو نہ تھا لیکن یتیمی سے بدتر حالت اس کے لئے مقدر تھی، باپ ایک ہندو باندی پر فریفتہ تھا اور اس نے اسے شادی رچا لی تھی وہ اس پر اس طرح سے فدا تھا کہ اس سے اور اس کی ماں سے بالکل نگاہیں پھیر لی تھیں۔ باپ کی شفقت سے محروم اور سوتیلی ماں کی بدسلوکی کے شکار اس نوجوان نے ہمت نہیں ہاری، مایوس اور پست حوصلہ نہیں ہوا اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنے تاریک و کربناک حال کو تابناک مستقبل سے ہمکنار کرنے کیلئے گھر سے چل نکلا۔ جونپور پہنچا، ایک مدرسہ میں داخل ہوا اور اپنی خداداد صلاحیت، ذہانت اور محنت کے نتیجہ میں اس مدرسے سے جلد ہی فارغ ہو گیا، لیکن اب اسے سکون کہاں تھا۔ مغلوں کی نفس پرستی، عیاشی اور غیر اسلامی زندگی اور اسکے نتیجہ میں پیدا ہونے والی سفاکی و بربریت نے اسے نیچے سے اوپر تک ہلا کر رکھ دیا۔ وہ کفن بردوش صورت حال سے نمٹنے کے لئے تیار ہو گیا۔ بالآخر چشم فلک نے دیکھا وہی نوجوان، جسکو گھر کی ہوا راس نہ آئی اور جسے گھر سے نکلنا پڑا، جس نے مفلس اور غریب طلبہ کے ساتھ بے سروسامانی اور خستہ حالی کے عالم میں تعلیمی مراحل طے کئے اور مدرسے کے شب و روز گذارے، اپنے اخلاص، للٰہیت، خدا ترسی، تدبر، فراست، بلند حوصلگی، و جرأت مومنانہ کی بدولت نفس پرست مغلوں کو ملک سے بے دخل کر کے، ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لینے میں کامیاب ہو گیا۔ دنیا اس نوجوان کو شیر شاہ سوری کے نام سے جانتی ہے جس کے دورِ اقتدار میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے، جس نے انصاف کے معاملہ میں اپنے عزیزوں کو بھی نہیں بخشا۔ ملک کے نظم و نسق اور استحکام، جرائم کی روک تھام، عدل و انصاف، تعمیری کام اور بیرونی حملوں سے حفاظت کے سلسلے میں اس نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ دنیا آج بھی انگشت بدنداں ہے۔

وہ بھی تو ایک عربی مدرسہ ہی کا فارغ تھا اور آج عربی اداروں سے سند عالمیت و فضیلت حاصل کرنے والوں کی طرح وہ بھی ایک عالم و فاضل ہی تھا۔ اس نوجوان کی اولوالعزمی دیکھئے، اس کی عقابی صفات کا اندازہ لگائیے ستاروں پر کمندیں ڈالنے کا حوصلہ ملاحظہ کیجئے، زندگی کی توانائیوں سے کتنا بھرپور تھا وہ اور کتنا معمور تھا اس کا سینہ!!!

کاش!! آج بھی کوئی شخص جو اس ظلم کی ماری دنیا کو انصاف سے بھر دیتا۔ ■■

وَھٰذا عیدُنا

صباح الدین ملک

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اسی لیے انتہائی معقول اور نہایت ہی سہل العمل ہے۔ اسی کے ساتھ وہ ہر طرح کے غلو و تکلف سے پاک اور حقیقیات پر مبنی ہے نیز ہر زمان و مکان پر منطبق ایک آفاقی دین ہے۔

دین کے تمام احکام و ہدایات کی طرح اس کی عبادات میں بھی مذکورہ خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ مثال کے طور پر نماز پرستش کا معقول ترین اور سہل طریقہ ہے۔ دیگر مذاہب کی طرح کوئی پیچیدہ حرکات یہاں نہیں ہے۔ اس کی تمام تفصیلات خدا و رسول کی طرف سے متعین اور واضح ہیں۔ ہر علاقہ اور ہر زمانہ کے لیے یکساں قابلِ عمل ہیں۔ روزہ، حج اور زکوٰۃ کا حال بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔

عبادات کے طریقوں کے ساتھ اوقات کی تعیین میں بھی کوئی ابہام باقی نہیں رکھا گیا ہے اور مختلف عبادات کو پروگرام کچھ اس ڈھنگ سے ترتیب دیا گیا ہے کہ ہر وقت و موسم کے تنوع کا مزہ آئے۔ اگر پنج گانہ نمازیں صرف ایک ہی وقت میں پڑھی ہوتیں یا صرف دن یا رات ہی سے مخصوص ہوتیں تو یک رنگی و یکسانیت محسوس ہوتی۔ صبح کے سہانے وقت میں اور دوپہر کے تیز اجالے میں، عصر کے ڈھلتے سایے میں، مغرب کی سرمئی روشنی میں اور عشاء کے وقت زندگی میں ہر حال و ہر منظر کا لطف موجود ہے۔ رمضان اور حج بھی گرما کی تپش، سرما کی ٹھنڈک اور برسات کی خنکی لے کر آتے رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی کو دو قدرتی چراغوں سے منسلک کر دیا ہے۔ یومیہ نماز کو روزانہ نکلنے اور ڈوبنے والے سورج سے اور سالانہ رمضان و حج کو ماہ بماہ نکلنے والے چاند سے۔ نتیجہ کہ ہر دور و ہر خطہ کے لوگوں کے لیے آسان ہو گیا کہ وہ شمس و قمر کو دیکھ کر خدا کی عبادت کریں۔

حکم دیا گیا کہ طلوعِ شمس کے وقت آسمان پر نمایاں ہوں تو یادِ خدا کے لیے بیدار ہو جاؤ۔ جب بھی آفتاب نصف النہار سے گزرے تو نماز کرو، جب یہ زوال پذیر ہو جائے تو خدا کے آگے جھکو، جب یہ غروب ہو جائے تو سجدہ ریز ہو جاؤ اور جب غروب کے آثار بھی ختم ہو جائیں تو خدا کی حمد و تسبیح کرو۔

یہ سورج نماز کا قدرتی کیلنڈر ہے۔ اس تقویم کی خوبی یہ ہے کہ یہ صحرا و بیاباں میں بھی میسر اور کارآمد ہے اور بستیوں میں بھی۔ یہ مفلس کو بھی دستیاب ہے اور مالدار شخص کو بھی۔ اگر اس قدرتی تقویم کی بنیاد پر کوئی کیلنڈر سہولت کی خاطر انسان بنائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہاں تو اصل کیلنڈر سے اسے مدد لیتا رہے اور اپنے مصنوعی کیلنڈر کی اصلاح کرتا رہے۔ اسی صورت میں وہ قابلِ اعتماد ٹھہرتا ہے۔

اسی طرح چاند بھی قدرتی کیلنڈر ہے جو آسمان کی وسعتوں میں چمکتا ہے۔ جسے ہر کوئی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ یہ سہل الحصول اور سب کی دسترس میں بھی ہے اور تمام عبادات کو موسم کی یکسانیت سے محفوظ کرنے والا بھی۔ بصورتِ دیگر شمسی حساب میں ان پڑھ افراد اور اقوام یا بادیہ سے باہر رہنے والے لوگ کیونکر اس سے آگاہ ہوتے، نیز شمسی مہینے تو موسم کے اعتبار سے جامد واقع ہوتے ہیں۔ جنوری ہمیشہ جاڑے کا موسم ہے۔ اگر روزے جنوری میں مقرر ہوتے تو سدا سرمائی ہو جاتے، اور جہاں جنوری میں گرمی پڑتی ہے وہاں سدا گرمائی ہو جاتے۔

لیکن اس آسمانی کیلنڈر کے ہر خاص و عام کی رسائی کے باوجود عید کے موقع پر اکثر جو صورتِ حال پیش آتی ہے ہم سب واقف ہیں۔ اس کی ایک مثال ہمارے ایک قصبہ میں پیش آمدہ یہ واقعہ ہے:

انسانی کیلنڈر ۲۹ کے ہلال کی نفی کرتا ہے پھر بھی ماہِ رمضان کے آخر میں لوگوں کی بے تابانہ نگاہیں ہلالِ عید کی تلاش میں افقِ آسمان پر اٹھتی ہیں۔ تلاشِ بسیار کے بعد بھی دیدارِ ہلال نہیں ہوتا۔ کان ریڈیو اور آنکھیں ٹیلیویژن کے پردے پر ہوتی ہیں۔ تراویح نہیں پڑھی جاتی یہاں تک سحری کھائی جاتی ہے، نیتِ روزہ کر لی جاتی ہے۔ ہمارا مغرب (دہلی اور پاکستان) رویتِ ہلال کی نفی کرتا ہے اور ہمارا مشرق (کلکتہ و بنگلہ دیش) بھی

رؤیت کی تائید نہیں کرتا، یہاں تک کہ صبح سویرے چند ریڈیو اسٹیشن رانچی کے ایک قصبہ میں سے رؤیت کی خبر دیتا ہے۔ امارت شرعیہ بہار اور خانقاہ مجیبیہ کے سربراہوں کے حوالہ سے اس خبر کا اعلان ٹیلیویژن پر ایک خاتون سناتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جنوبی ہند کے ایک علاقہ سے بھی اسی طرح کی ایک خبر آتی ہے۔ نوجوانوں اور بچوں کا ایک انبوہ قصبہ کی مسجد کی طرف آتا ہے کہ مسجد سے رؤیت عید کا اعلان کیا جائے۔ ہر آدمی اپنے علم و فہم کے مطابق رائے زنی کر رہا ہے۔ کچھ علماء اور فہیم لوگوں کی ایک مجلس اس گرم ماحول میں صورت حال پر غور کرنے کے لئے بیٹھتی ہے۔ ارکان مجلس میں کوئی رؤیت ہلال کے مسائل پر پوری واقفیت رکھتا محسوس نہیں ہوتا۔ ایک طرف یہ مجلس سرگرم بحث اور اس کے ارکان باہم دگر برسرِ پیکار ہوتے ہیں اور دوسری طرف عام نوجوانوں کا گروہ بس ایک ہی فیصلہ سننے پر تُلا ہوتا ہے یعنی یہ کہ بہر صورت عید ہو۔ بالآخر مجلس کی ترجیح یہ فیصلہ سناتی ہے کہ روزہ توڑ دیا جائے، تاخیر ہونے کی وجہ سے نمازِ عید کل قضا کی جائے۔ جسے چاند کے ہونے پر شرحِ صدر نہ ہو وہ روزہ رکھ بھی سکتا ہے۔ بعض جوشیلے افراد نے اختلاف کرنے والوں سے الگ نمازِ عید قائم کرنے کا اعلان کیا۔ غرض ایک انتشار کی کیفیت طاری رہی۔

ایسے ہی ملتے جلتے واقعات بہت سی دوسری جگہوں پر پیش آئے۔ اسی طرح کی صورت حال کو دیکھ کر بعض پڑھے لکھے لوگ جوش میں آکر قلم اٹھا لیتے ہیں اور QUESTION کرنا شروع کر دیتے ہیں جن کا رخ اکثر علماء کی طرف ہوتا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ جب رمضان کا سارا کاروبار افطار، سحری، نماز، تراویح علمِ فلکیات کی بنیاد پر مرتب کئے ہوئے میقاتی جدولوں اور تقویموں پر ہوتا ہے تو تاریخوں کے معاملہ میں ان پر کیوں نہیں اعتماد کیا جاتا؟ سائنس کے اس ترقی یافتہ دور میں چاند کے وجود کی تعیین کچھ مشکل تو نہیں ہے۔ حالانکہ انھیں معلوم ہونا چاہئے تھا کہ نماز وغیرہ کے اوقات کو شریعت نے شمسی آثار پر قائم کیا ہے اور اسے سہولت کی خاطر اگر انسان اپنے علم و تجربہ کی مدد سے منضبط کر لیتا ہے تو شریعت کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوتی کیونکہ سورج جیسی روشن شے کے طلوع و غروب کو متعین کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ سائنس نیز عام مشاہدہ کی رو سے زمین کی سورج کے سامنے اکہری گردش ۲۴ گھنٹے میں مکمل ہو جاتی ہے۔ گھڑی ہمیں اسی گردش کو بتاتی رہتی ہے۔ اب اگر نماز وغیرہ میں گھڑی پر اعتماد کیا جاتا ہے تو کیا برائی ہے جب کہ شریعت نے

نماز کے اوقات کو POINT OF TIME کے بجائے SPAN OF TIME متعین کیا ہے۔ اس کے برعکس چاند کا معاملہ بالکل جدا ہے۔ شارع نے رمضان و عید وغیرہ کا مدار اس کی رؤیت پر رکھا ہے نہ کہ اس کے وجود پر۔ اس لئے بغیر رؤیت کے صرف جنتری پر اعتماد یا دوربین وغیرہ پر بھروسہ حکمِ شریعت سے متصادم ہے۔ یہ بھی مشاہدہ ہے کہ ماہرین چاند کی زمین کے ساتھ سورج کے سامنے دہری گردش کو صحیح طور پر متعین نہیں کر پاتے اور جنتری غلط ثابت ہوتی رہتی ہے۔

اسی طرح وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ریڈیو اور ٹی وی کی خبر پر وقت کے معاملہ میں اعتماد کیا جاتا ہے اسی سے گھڑیاں ملائی جاتی ہیں پھر رؤیت ہلال کی خبر پر اعتبار کرنے میں لوگ کیوں گتھم گتھا اور باہم دست و گریباں ہو جاتے ہیں؟ یہ سوال بھی بے سوچے سمجھے کیا جاتا ہے۔ ریڈیو وغیرہ کی خبریں بارہا جھوٹی ثابت ہوتی رہتی ہیں۔ گزشتہ سال ہی شاہی مسجد دہلی کے امام کے نام پر رؤیت ہلال کی جھوٹی خبریں نشر کی گئی تھیں۔ غرض یہ کہ یہ ایسا یقینی اور قابلِ اعتبار ذریعہ نہیں ہے کہ آنکھ بند کر کے اس پر بھروسہ کیا جا سکے۔

پھر ان سوالوں کو دورِ آخر اتحادِ ملت کے حوالے سے کیا جاتا ہے کہ اختلافِ رؤیت ہلال اور ریڈیو پر اعتبار نہ کرنے کے نتیجہ میں عید کا تہوار بھی جو اتحادِ ملت کا نشان ہے، جھگڑے کی نذر ہو جاتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے قبل اسی جذباتی آنچ کو ختم کیا جائے۔

آیا عید تہوار ہے یا عبادت؟ اس سوال کا جواب ہر صاحبِ بصیرت کے نزدیک یہ ہوگا کہ یہ عبادت ہے یا کم از کم پہلے عبادت ہے، تہوار بعد میں۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ دونوں کا جو اصل عمل ہے وہ یہ ہے: نمازِ عید، صدقۂ فطر اور قربانی، غسل و طہارت اور بلا شبہ محبت و اخوت کا اظہار وغیرہ۔ دیگر اہلِ مذاہب کے تہواروں کی طرح یہاں کوئی کام بھی بے معنی اور محض تفریح طبع کے لئے نہیں ہے بلکہ ان دونوں تہواروں کی وجہ تقریب ہی دو انتہائی اہم بالشان عبادات ہیں۔ صیام رمضان و تراویح کا اہتمام و تکمیل اور ابراہیمی قربانی کی یاد۔ محض نئے کپڑے اور میٹھے پکوان اور خوشی کے ماحول کو دیکھ کر اسے تہوار یا خالص تہوار نہیں کہا جا سکتا۔ ہماری عیدین اصلاً عبادت ہیں تہوار بعد میں۔ سمجھنے کے لئے تہوار کا لفظ استعمال کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے لیکن اس لفظ سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔

پھر عید کے بارے میں محض یہ کہہ دینا کہ یہ ملی اتحاد کا نشان ہے، بڑی کم نظری کی بات ہے۔ عیدین اتحاد کے مظاہرہ کے لئے منعقد نہیں ہوتیں۔ بلکہ جیسا کہ پہلے مذکور ہوا، یہ رمضان کے بابرکت مہینے کے خاتمہ پر خیر و برکت بطور شکرانہ اور دوسری قربانی کی یاد میں منائی جاتی ہے۔ البتہ اسلام کی تمام عبادتوں کی طرح اس میں بھی اجتماعیت کی روح کو داخل کر دیا گیا ہے کہ اتحاد مسلمان کا شعار ہے۔ سب سے پہلے کسی کو اس فریب میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے کہ یہاں اتحاد ہی اصل مقصد ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ نماز، روزے اور حج کا اصل مقصد اجتماعیت اور اتحاد ہے گرچہ سب میں اجتماعی روح علاً کارفرما ہے۔ جب ایک ہی شہر میں عام نمازوں، یہاں تک کہ جمعہ و عیدین کی نمازوں کے اوقات میں فرق سے ملی اتحاد میں کوئی رخنہ نہیں پڑتا تو رویت ہلال کے مطابق مختلف علاقوں کی عید مختلف ہو جانے سے اتحاد کیسے پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ امت کے اتحاد کی بنیادیں اتنی معمولی چیزوں پر نہیں رکھی گئی ہیں۔ اس کا اتحاد عقائد و عبادات اور مقاصد کے اتحاد سے ہے۔ امت تو بحیثیت کل بے امیر رہنے پر آمادہ ہے جس کی بے برکتی و نحوست میں صدیوں سے گرفتار ہی ہے۔ کاش اس کی فکر میں کوئی تحریک اور قدم اٹھائے۔ یہ صحیح ذہنیت کو ظاہری چیزوں کو بنیاد بنا دیا جائے۔ یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ جس طرح ایک مسجد میں مثلاً ظہر کی نماز با جماعت ایک ہی بار قائم ہونی چاہئے اور جملہ مساجد میں ایک ہی نماز جمعہ، اسی طرح ایک عیدگاہ میں ایک ہی نماز ہونی چاہئے اگر اس میں اختلاف واقع ہو تو یہ ناقابل فہم ہی نہیں قابل تشویش ہے تفرقہ و انتشار اگر کوئی ہے تو وہ یہی۔ رہی یہ بات کہ دو مقامات پر یا ملک میں عید دو دن ہو جائے تو یہ قرین عقل اور فطرت ہے۔

اس تمہیدی گفتگو کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احادیث رسول کی روشنی میں رویت ہلال کے پورے مسئلہ پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ مسئلہ کو تین ذیلی ابواب میں مرتب کیا جا سکتا ہے۔

روزہ و عید رویت ہلال کی بنیاد پر

روزہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد قرآن میں یوں موجود ہے: کتب علیکم الصیام (تم پر روزے فرض کئے گئے) نیز فرمایا: فمن شہد منکم الشہر

فلیصمہ (البقرہ ۱۸۵) لہٰذا اب تم میں سے جو شخص اس مہینے (شہر رمضان) کو پائے اس کے روزے رکھے۔ مزید ارشاد ہوا کہ: واتموا الصیام الی اللیل۔ روزے رات تک پورے کرو اس کے ساتھ یہ بات بھی واضح ہے کہ ماہ و سال کی بنیاد اسلام میں شمسی کلنڈر کے بجائے قمری حساب پر رکھی گئی چنانچہ اس سلسلہ میں اللہ کا فرمان ہے کہ: والقمر قدرناہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب۔ ایک دوسرے مقام پر فرمایا: یسئلونک عن الاھلۃ قل ھی مواقیت للناس والحج۔

فرضیت صیام کے اجمالی احکام کی تفصیلی صورت گری احادیث رسول سے ہوتی ہے چنانچہ شہر رمضان کی تعیین کے واضح اصول رسول نے مقرر فرمائے۔ اس سلسلہ میں دین کی ٹھیک فطرت (الدین یسر) کے مطابق رویت ہلال کے لئے صاحب شریعت نے بہت سہل طریقہ تجویز کیا، ایسا طریقہ جو ہر دور، ہر خطہ اور ہر خاص و عام کی یکساں رسائی میں ہے اور اگر قدرتی اسباب کی بنا پر رویت سے معذوری ہو جائے تو یہ خاص رعایت رکھی گئی کہ شروع مہینہ کے ساتھ رواں مہینہ کو ۳۰ ایام تک پورا ہونے دیا جائے گویا شریعت نے انسان کو تمام الجھنوں سے بچاتے ہوئے ہلال کے وجود کو رمضان و عید کی بنیاد نہیں بنایا بلکہ محض رویت و شہود کو ماہ کے آغاز کی اساس بنایا۔ اس سلسلہ میں متعدد صریح حدیثیں مروی ہیں:

۱- اذا رأیتموا الہلال فصوموا و اذا رأیتموہ فافطروا (بخاری)	جب تم چاند دیکھو تو روزے رکھو اور جب اسے دیکھو تو روزے ختم کرو۔
۲- اذا رأیتموہ فصوموا و اذا رأیتموہ فافطروا فان غم علیکم فاقدروا لہ۔ (بخاری-ابن عمر)	جب چاند دیکھو تو روزہ شروع کرو اور جب اسے دیکھو تو روزہ ختم کرو، البتہ اگر مطلع ابر آلود ہو جائے تو اس کا اندازہ کرو۔
۳- صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ فان غبی علیکم فعدوا ثلاثین۔ (مسلم و احمد)	چاند دیکھ کر روزے رکھو اور اسے دیکھ کر افطار کرو لیکن اگر مطلع صاف نہ ہو تو تیس دن شمار کرو۔

۴- لا تصوموا حتی تروا الهلال ولا تفطروا حتی تروه فان غم علیکم فاقدروا له۔ (بخاری)

روزے نہ رکھو جب تک چاند نہ دیکھ لو اور افطار نہ کرو جب تک اسے دیکھ نہ لو۔ اگر فضا صاف نہ ہو تو اندازہ لگاؤ۔

۵- صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته فان غبی علیکم فاکملوا عدة شعبان ثلاثین۔ (بخاری۔ ابو ہریرہؓ)

اسے دیکھ کر روزے رکھو اور اسے دیکھ کر روزہ ختم کرو لیکن اگر ابر ہو جائے تو شعبان کے عدد کو تیس تک مکمل کرو۔

۶- صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته فان غم علیکم فصوموا ثلاثین یوما۔ (مسلم)

اسے دیکھ کر روزے رکھو اور اسے دیکھ کر روزہ ختم کرو۔ اگر فضا صاف نہ ہو تو تیس دن روزے رکھو

۷- لا تصوموا قبل رمضان صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته فان حالت دونه غیایة فاکملوا ثلاثین یوما۔ (ترمذی)

رمضان سے قبل روزہ مت رکھو بلکہ چاند دیکھ کر رکھو اور اسے دیکھ کر افطار کرو۔ اگر اس کے سامنے ابر آجائے تو تیس دن مکمل کرو۔

۸- صوموا لرؤیته فان حال بینکم وبینه سحاب فاکملوا العدة ولا تستقبلوا الشهر استقبالا۔ (نسائی۔ ابن عباسؓ)

اسے دیکھ کر روزہ رکھو، اگر تمہارے اور اس کے درمیان بادل حائل ہو جائے تو شمار پورا کرو اور مہینے سے آگے نہ بڑھو۔

۹- الشهر تسع وعشرون لیلة فلا تصوموا حتی تروه فان غم علیکم فاکملوا العدة ثلاثین۔ (بخاری)

مہینہ ۲۹ دن کا بھی ہوتا ہے تو جب تک چاند نہ دیکھو تو روزہ نہ رکھو۔ اگر ابر آجائے تو تیس کا شمار مکمل کرو۔

۱۰- الشهر تسع وعشرون یوما فلا تصوموا حتی تروا الهلال۔ (مؤطا مالک۔ ابن عمرؓ)

مہینہ ۲۹ دن کا بھی ہوتا ہے، تو جب تک چاند نہ دیکھو روزہ نہ رکھو۔

۱۱- الشهر یکون تسعة وعشرین ویکون ثلاثین فاذا رأیتموه فصوموا واذا رأیتموه فافطروا فان غم علیکم فاکملوا العدة۔ (نسائی۔ ابو ہریرہؓ)

مہینہ کبھی ۲۹ اور کبھی ۳۰ کا ہوتا ہے پس جب تم اسے دیکھو تو روزہ رکھو اور جب دیکھو تو ختم کرو ہاں اگر موسم ابر آلود ہو جائے تو گنتی پوری کرو۔

ان احادیث میں روزہ شروع کرنے اور عید کرنے کا مدار چاند کی رویت پر رکھا گیا ہے۔ لفظ "رویۃ" عربی زبان کا مشہور لفظ ہے جس کے معنی کسی چیز کو آنکھوں سے دیکھنے کے ہیں۔ اس کے سوا اگر کسی دوسرے معنی میں لیا جائے تو وہ حقیقت نہیں مجاز ہے۔ اس لئے ارشادات نبویؐ کا حاصل یہ ہوا کہ احکام شرعیہ جو چاند کے ہونے یا نہ ہونے سے متعلق ہیں ان میں چاند کا ہونا یہ ہے کہ عام آنکھوں سے نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ مدار احکام چاند کا افق پر وجود نہیں بلکہ رویت ہے۔ اگر چاند افق پر موجود ہو مگر کسی وجہ سے قابل رویت نہ ہو تو احکام شرعیہ میں اس وجود کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

دوربین کے ذریعہ کسی شعاعوں میں مستور چاند کو دیکھ لینا یا بذریعہ ہوائی جہاز پرواز کر کے بادلوں سے اوپر جا کر چاند کو دیکھ لینا عام رویت کہلانے کا مستحق نہیں۔ نیز احادیث میں رویت ہلال کی بتکرار تاکید اس لئے فرمائی گئی کہ رمضان کے آغاز کی علامت رویت ہلال ہے، کوئی حساب نہیں ہے۔ جنتری کے حساب سے شعبان کا ختم معتبر نہیں ہے بلکہ آغاز رمضان کے لئے رویت ہلال ضروری ہے۔ اسی طرح رمضان کے اختتام کا فیصلہ بھی رویت ہلال سے ہے کسی حساب سے نہیں۔ نیز یہ کہ اگر علاقے کے لوگوں نے عام طور پر چاند دیکھ لیا ہو تو پھر یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص انفرادی طور پر چاند دیکھے۔

البتہ رویت ہلال کے سلسلہ میں مطلع غبار آلود یا ابر آلود ہونے کی صورت میں جو دقت پیش آتی ہے اس سے متعلق ہدایت کی گئی کہ ۲۹ کو چاند نظر نہ آنے کی صورت میں مہینے کے تیس دن پورے کئے جائیں نہ کہ رمضان کا اعلان کسی حساب کی بنا پر کیا جائے۔ اس طرح اس تذبذب کو ختم کر دیا گیا جو ۲۹ تاریخ کو چاند نظر نہ آسکنے کی وجہ سے دلوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ شک کی کیفیت میں روزہ جیسے عمل کو کرنے سے رسولؐ کی نافرمانی سے تعبیر کیا گیا کیوں کہ دین کے اعمال یقین پر مبنی ہونے چاہئیں۔ دین شک اور وہم کا نام نہیں ہے۔ چنانچہ منقول ہے:

عن عمار بن یاسر قال من صام الیوم الذی یشک فیه فقد عصی

ابا القاسم ﷺ۔ (ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی) "حضرت عمار بن یاسرؓ نے فرمایا کہ جس نے شک کے دن روزہ رکھا اس نے ابو القاسم ﷺ کی نافرمانی کی۔"

یہاں شک کے دن سے مراد وہ دن ہے جس میں یہ بات مشکوک ہو کہ آیا آج رمضان شروع ہو گیا ہے یا نہیں۔ ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ عبادت کی بنیاد شک پر نہیں بلکہ یقین پر ہونی چاہئے۔ شک کے دن سے مراد ۳۰ شعبان ہے اس صورت میں کہ ۲۹ شعبان کو چاند نظر نہ آئے اور یہ بات قطعی طور پر معلوم نہ ہو سکے کہ کل ۳۰ شعبان ہے یا یکم رمضان۔

اگر کوئی شخص یوم الشک میں روزہ رکھے اور اگلے دن یہ واضح ہو جائے کہ آج واقعی رمضان ہے تو جمہور (جن میں مالکیہ، شافعیہ اور حنبلیہ شامل ہیں) کے نزدیک اگرچہ اس شخص کے لئے ضروری ہے کہ کھانے پینے سے رکا رہے لیکن اس کا وہ روزہ رمضان کا روزہ شمار نہ ہوگا اور بعد میں اس کے ذمہ اس دن کی قضا ضروری ہوگی۔

اس سے آگے بڑھ کر یقین کی کیفیت میں بھی رمضان سے ما قبل روزہ رکھنے سے منع فرمایا گیا۔ فرمایا:

لا تقدموا الشهر بيوم ولا بيومين الا ان يوافق ذلك صوما كان يصومه احدكم۔ (ترمذی)

رمضان سے ایک یا دو دن قبل روزہ نہ رکھو الا یہ کہ وہ دن پڑ جائے جس دن کوئی معمول کا روزہ رکھتا ہو۔

لا يتقدمن احدكم رمضان بصوم يوم او يومين الا ان يكون رجل كان يصوم صومه فليصم ذلك اليوم۔ (متفق علیہ)

رمضان سے ایک یا دو دن قبل کوئی ہرگز روزہ نہ رکھے، الا یہ کہ کوئی اس دن معمولاً رکھتا رہا ہو تو وہ رکھ لے۔

مزید یہ کہ روزہ شروع کرنے کے بعد چاند دیکھ کر شک کرنے کا بھی کوئی راستہ نہیں چھوڑا گیا۔ چنانچہ صحابہ کے زمانہ کا ایک واقعہ روایات میں اس طرح درج ہے:

عن ابي البختري قال خرجنا للعمرة فلما نزلنا ببطن نخلة ترائينا الهلال

ابو البختری کا بیان ہے کہ ہم عمرہ کے سفر میں بطن نخلہ میں ٹھہرے تو چاند دیکھ کر ہم میں سے کسی نے کہا کہ کل کا

فقال بعض القوم هو ابن ثلاث وقال بعض القوم هو ابن ليلتين فلقينا ابن عباس فقلنا انا رأينا الهلال فقال بعض القوم هو ابن ثلاث وقال بعض القوم هو ابن ليلتين فقال اي ليلة رأيتموه فقلنا ليلة كذا وكذا فقال ان رسول الله ﷺ مده للرؤية فهو لليلة رأيتموه وفي رواية قال رسول الله ﷺ ان الله تعالى قد امده لرؤيته فان اغمي عليكم فاكملوا العدة۔ (مسلم)

چاند ہے اور کسی نے کہا کہ پرسوں کا ہے۔ ہماری ملاقات ابن عباسؓ سے ہوئی تو ہم نے واقعہ بیان کیا۔ یہ سن کر انھوں نے ہم سے پوچھا کہ تم نے کس رات چاند دیکھا تھا؟ تو ہم نے بتایا کہ فلاں رات۔ اس پر انھوں نے کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مہینے کی مدت چاند کی رویت تک قرار دی ہے۔ ایک دوسری روایت کی رو سے انھوں نے یہ کہا کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مہینے کی امتداد کو رویت ہلال تک رکھا ہے۔

پھر آپؐ نے فرمایا:

والصوم يوم تصومون والفطر يوم تفطرون والاضحى يوم تضحون۔ (ترمذی)

روزہ اس دن ہے جس دن تم روزہ رکھو، افطار اس دن ہے جس دن افطار کرو اور قربانی اس دن ہے جس دن قربانی کرو۔

عن ابي هريرة قال قال رسول الله ﷺ فطركم يوم تفطرون واضحاكم يوم تضحون۔ (ابوداؤد)

عید الفطر اس دن ہے جس دن تم افطار کرو اور عید قربان اس دن ہے جس دن تم قربانی کرو۔

گویا ان احادیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جب شرعی ثبوت کے بعد روزہ رکھ لیا یا شرعی ثبوت کے بعد افطار کر لیا اور عید منا لی تو اب دوسرے قرائن کی بنا پر خواہ مخواہ شکوک و اوہام میں مبتلا نہ ہونا چاہئے بلکہ روزہ اور عید درست ہو گئے۔ گویا بعض لوگ چاند کے چھوٹے یا بڑے ہونے کی وجہ سے جو وسوسے پھیلاتے ہیں ان کی نفی مقصود ہے کہ اصل مدار ثبوت شرعی پر ہے اس کے بعد وساوس کا کوئی درجہ نہیں۔

رمضان کی صحیح تعیین کے لئے آپ شعبان کا چاند دیکھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں درج ذیل ہدایات و معمولات مروی ہیں:

احصوا هلال شعبان لرمضان۔ (ترمذی) یعنی رمضان کے لئے شعبان کا ہلال دیکھنے کا اہتمام کرو۔

عن عائشة قالت: كان رسول الله يتحفظ من شعبان ما لا يتحفظ من غيره ثم يصوم لرؤية رمضان فإن غم عليه عد ثلاثين يوما ثم صام۔ (ابوداؤد) یعنی دوسرے مہینوں کی نسبت شعبان کی زیادہ حفاظت کرتے تھے (تاریخیں معلوم کرنے کا اہتمام کرتے تھے) پھر رمضان کا چاند دیکھ کر روزہ رکھتے تھے۔ مطلع صاف نہ ہوتا تو شعبان کے تیس دن شمار کرکے روزہ رکھنا شروع کرتے تھے۔

عن ابن عمر عن النبي: وإن أحسن ما يقدر له إذا رأينا هلال شعبان لكذا وكذا فالصوم إن شاء الله لكذا وكذا إلا أن يروا الهلال قبل ذلك۔ (ابوداؤد)

اچھا اندازہ یہ ہے کہ جب ہم شعبان کا چاند فلاں فلاں روز دیکھیں تو روزہ فلاں فلاں دن ہوگا مگر جب چاند اس سے پہلے دکھائی دے تو چاند سے روزے رکھے کیونکہ شرع میں رویت کا اعتبار ہے اندازہ کا نہیں)۔

یہ اہتمام اس لئے ضروری ہے کہ ہلالِ رمضان کی تلاش کرتے وقت یہ یقینی طور پر معلوم رہے کہ آج شعبان کی ۲۹ تاریخ ہے یا تیس۔ خصوصاً ابر کی حالت میں۔ بصورتِ دیگر رمضان کے آغاز کا فیصلہ کرنے میں مشکل پیش آسکتی ہے۔

اس سلسلے میں آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا:

عن حذيفة بن اليمان عن رسول الله قال لا تقدموا الشهر حتى تروا الهلال قبله أو تكملوا العدة ثم صوموا حتى تروا الهلال أو تكملوا العدة قبله۔ (نسائی)

رمضان کے آگے روزے مت رکھو جب تک چاند نہ دیکھ لو یا شعبان کے تیس دن پورے نہ کرلو۔ پھر روزے رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو یا تیس روزے پورے کرو۔

عن ربعي بن حراش عن بعض أصحاب النبي: لا تقدموا الشهر حتى تكملوا العدة أو تروا الهلال ثم صوموا ولا تفطروا حتى تروا الهلال أو تكملوا العدة ثلاثين۔ (نسائی)

رمضان کے آگے روزہ مت رکھو جب تک شعبان کا شمار پورا نہ کرو یا چاند نہ دیکھو۔ پھر روزے رکھو اور روزوں کو موقوف نہ کرو جب تک چاند نہ دیکھ لو یا شمار نہ پورا کرلو۔

کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ چاند مغرب سے قبل دن ہی میں نظر آجائے۔ ایسی صورت میں ہلال کا اعتبار نہ ہوگا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ کا واقعہ نسائی میں یوں منقول ہے:

عن مالك أنه بلغه أن الهلال رئي في زمن عثمان بن عفان بعشي فلم يفطر عثمان حتى أمسى وغابت الشمس۔ (نسائی)

مالک کو معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں چاند تیسرے پہر کو دکھائی دیا تو عثمانؓ نے روزہ نہیں توڑا یہاں تک کہ شام ہوئی اور آفتاب ڈوب گیا۔ ••

باقی آئندہ

فارم ۴

ماہنامہ مجلہ حیاتِ نو

مقامِ اشاعت: بلریا گنج اعظم گڈھ
وقفۂ اشاعت: ماہنامہ
مالک: انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڈھ
پرنٹر و پبلشر: نور محمد، جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ
ایڈیٹر: نور محمد، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڈھ

میں نور محمد پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا واقعات میرے علم و اطلاع کے مطابق صحیح ہیں

نور محمد

حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ

تحریر: ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت پاشا .... ترجمانی: ابو جاوید

وہ کون ہے جس کے متعلق نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر سات آسمانوں کی بلندی سے سرزنش و عتاب نازل کیا گیا؟ وہ کون ہے جس کی شان میں خدائے تعالیٰ کے یہاں سے وحی لے کر جبرئیل آتے تھے؟ وہ موذن رسول حضرت عبداللہ بن ام مکتوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو۔

ابن ام مکتوم مکہ کے باشندے اور خاندان قریش کے چشم و چراغ تھے۔ یہی رشتے کے ذریعہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ وہ ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ان کے والد کا نام قیس بن زائد اور والدہ کا اسم گرامی عاتکہ بنت عبداللہ تھا جو عام طور سے اپنی کنیت ام مکتوم کے ساتھ مشہور تھیں کیونکہ حضرت عبداللہ پیدائشی نابینا تھے۔

سرزمین عرب جس وقت نیر اسلام کی ضیا پاشیوں سے منور ہوئی، حضرت عبداللہ موجود تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے سینے کو ایمان کے لئے کھول دیا۔ وہ اہل اسلام کے اس گروہ میں شامل ہو گئے جس نے اولین مرحلے میں داعیٔ اسلام کی پکار پر لبیک کہا اور انھوں نے ان مصائب و آلام کا نہایت پامردی اور ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کیا جن سے مسلمان دوچار ہوئے۔ انھوں نے اس راہ میں کسی قسم کی قربانی اور فداکاری و جاں سپاری سے دریغ نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ قریش کی اذیتوں کا ڈٹ کر سامنا کیا اور ان کی زیادتیوں کو صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیا۔ اس راہ میں نہ تو ان کے پائے استقلال میں ذرہ برابر لغزش پیدا ہوئی نہ ان کا حوصلہ پست ہوا نہ ان کی قوت ایمانی میں کسی رخ سے کمزوری کے آثار ظاہر ہوئے بلکہ ان مصائب نے ان کے اندر خدا کے دین سے ربط محکم، اس کی کتاب سے تعلق، اس کی شریعت سے اکتساب فیض اور بارگاہ رسالت میں شوق حاضری کو مزید جلا بخشی۔

ان کے اندر بارگاہ رسالت میں حاضری اور حفظ قرآن کا شوق اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ ہر فرصت کو غنیمت سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھاتے اور ہر موقع کو قیمتی جان کر اس کی طرف تیزی سے لپکتے تھے بلکہ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ اس شوق میں وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور دوسروں کے حصے کا وقت بھی لے لیتے تھے۔ اس زمانے میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قریش کے بڑے بڑے سرداروں کی طرف بڑی شدت کے ساتھ متوجہ تھے۔ آپ کے دل میں یہ تمنا ہر وقت سر اٹھاتی رہتی تھی کہ رؤساء قریش، اشراف اسلام میں داخل ہو جاتے۔ انہی دنوں کی بات ہے ایک دن آپ عتبہ ابن ربیعہ، اس کے بھائی شیبہ ابن ربیعہ، عمرو بن ہشام (ابوجہل)، امیہ ابن خلف اور خالد سیف اللہ کے والد ولید بن مغیرہ سے ملے۔ آپ ان کے ساتھ تنہائی میں گفتگو کر کے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کر رہے تھے۔ آپ کی دلی خواہش تھی کہ وہ لوگ اسلام قبول کر لیں یا کم از کم آپ کے ساتھیوں پر ایمان کی اذیت رسانی سے باز آجائیں۔ ابھی آپ گفتگو کر رہے تھے کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کتاب اللہ کی کوئی آیت پڑھنے کے لئے یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے:

"اے اللہ کے رسول! مجھے اس میں سے کچھ سکھا دیجئے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھایا ہے۔"

لیکن آپ نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ اس کے برعکس آپ کے چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے اور اس امید میں کہ یہ اسلام قبول کر لیں گے اور ان کا اسلام خدا کے دین کی قوت اور اس کے رسول کی دعوت کی تائید کا ذریعہ بنے گا، آپ بدستور ان قریشیوں کی طرف متوجہ رہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کی ملاقات سے فارغ ہو کر ابھی گھر جانے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ آپ کے اوپر نزول وحی کی کیفیت طاری ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

عَبَسَ وَتَوَلّٰى، اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى، وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى، اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى، اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى، فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى، وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى، وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى، وَهُوَ يَخْشٰى، فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى، كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ، فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ، فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ، مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ، بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ، كِرَامٍ بَرَرَةٍ۔[1]

[1] عبس ۱ — ۱۶

ترجمہ: ”ترش رو ہوا اور بے رخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ تمہیں کیا خبر شاید وہ سدھر جائے اور نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لئے نافع ہو؟ جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے اس سے تم بے رخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں، بلند مرتبہ ہیں، پاکیزہ ہیں، معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔“

یہ وہ آیتیں ہیں جنھیں حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ کی شان میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل کیا۔ یہ آیات اپنے یوم نزول سے اب تک تلاوت کی جا رہی ہیں اور قیامت تک برابر پڑھی جاتی رہیں گی۔

اس روز کے بعد سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ابن ام مکتوم کا بہت لحاظ کرنے لگے۔ وہ جب بھی آپؐ کے یہاں قیام کرتے آپؐ ان کی بڑی خاطر تواضع کرتے۔ وہ جب بھی آپؐ کی مجلس میں آتے آپ انھیں اپنے قریب بٹھاتے، ہمیشہ ان کی خیریت دریافت کرتے اور ان کی ضروریات پوری کرتے رہتے تھے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، یہ عبداللہ ابن ام مکتومؓ ہی تو تھے جن کے بارے میں سات آسمانوں کی بلندی سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر سخت ترین عتاب نازل ہوا تھا۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان پر قریش کا غیظ و غضب حد سے فزوں ہو گیا اور ان کے ظلم و ستم کی کوئی انتہا نہ رہی تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہجرت کی اجازت دے دی۔ اجازت ملتے ہی حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم نے اپنے دین کی حفاظت کے لئے ترک وطن کرنے میں بڑی تیزی سے کام لیا۔ چنانچہ اصحاب رسول میں سے وہ اور حضرت مصعب بن عمیرؓ سب سے پہلے مدینہ پہنچے تھے۔

حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ نے یثرب پہنچتے ہی اپنے رفیق حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ساتھ مل کر لوگوں سے ملاقاتیں کرنے، انھیں قرآن پڑھانے اور دین کی دعوت دینے کا سلسلہ شروع کر دیا اور جب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے حضرت

عبداللہ ابن ام مکتوم اور حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہما کو موذن مقرر کیا کہ وہ دن میں پانچ مرتبہ توحید کا اعلان کریں، انھیں بہترین عمل (نماز) کے لئے بلائیں اور خیر و فلاح پر ابھاریں۔ عام طور پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان دیتے اور حضرت ابن ام مکتومؓ نماز کے لئے اقامت کہتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اذان حضرت ابن ام مکتومؓ دیتے اور اقامت بلالؓ کہتے تھے۔ رمضان المبارک کے مہینے میں تو ان دونوں کی شان ہی نرالی ہوتی تھی۔ مدینے کے مسلمان ایک کی اذان پر سحری کھاتے اور دوسرے کی اذان پر اس سے رک جاتے تھے۔ حضرت بلالؓ رات کے پچھلے پہر اذان دے کر سوتے ہوئے لوگوں کو نیند سے بیدار کرتے اور حضرت ابن ام مکتومؓ طلوع فجر کا انتظار کرتے رہتے اور طلوع صبح صادق کے ساتھ ہی نماز کے لئے اذان دے دیتے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ابن ام مکتومؓ کی عزت افزائی اور قدر دانی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے اپنی عدم موجودگی کے مختلف مواقع پر دسیوں بار ان کو مدینہ پر اپنا نائب مقرر کیا۔ ان میں سے ایک موقع وہ بھی تھا جب آپ نے فتح مکہ کے لئے مدینہ چھوڑا تھا۔

غزوۂ بدر کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کی شان بڑھانے، جہاد سے جی چرانے والوں پر ان کی فضیلت جتانے، مجاہدین کو جہاد پر اکسانے اور جہاد میں شرکت نہ کرنے والوں کے رویے پر اظہار ناگواری کرتے ہوئے اپنے نبی پر قرآن کریم کی چند آیتیں نازل کیں تو حضرت ابن ام مکتومؓ کے دل پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا اور اس شرف سے محرومی ان کو بہت شاق گزری اور انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

”اے اللہ کے رسولؐ! اگر میرے پاس استطاعت ہوتی تو میں جہاد میں ضرور شریک ہوتا۔“

پھر انھوں نے نہایت سوز و گداز کے ساتھ اللہ سے دعا کی کہ وہ ان کے اور ان کے جیسے دوسرے معذور لوگوں کے بارے میں قرآن نازل فرمائے جو اپنی جسمانی معذوری کے سبب شرکت جہاد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ وہ بڑے خشوع و تضرع کے ساتھ دعا مانگتے

اللّٰھم انزل عذری...... اللّٰھم انزل عذری۔ ”خدایا! میرے عذر کے متعلق قرآن نازل فرما دے...... خدایا!......“ اور اللہ تعالیٰ نے جلد ہی ان کی اس دعا کو شرف قبولیت سے نواز دیا۔

کاتبِ وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ:

ایک روز میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں بیٹھا تھا کہ یکایک آپؐ کے اوپر سکینت وقار کی کیفیت طاری ہوگئی اور اسی حالت میں آپ کا زانوئے مبارک میرے زانو پر جا کر ٹک گیا اس سے میرے زانو پر زبردست بوجھ پڑنے لگا۔ ایسا بوجھ کہ اس سے زیادہ وزن میں نے آج تک کسی چیز کا محسوس نہیں کیا تھا۔ جب آپؐ کے اوپر سے یہ کیفیت دور ہوئی تو مجھ سے فرمایا کہ زید! لکھو، اور میں نے لکھا:

"لا یستوی القاعدون من المؤمنین والمجاهدون فی سبیل اللہ باموالهم وانفسهم" (النساء ۹۵) "مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو گھر بیٹھے رہتے ہیں اور جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں، دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔"

تو ابن ام مکتوم نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ "اے اللہ کے رسولؐ! جو لوگ جہاد میں شریک ہونے کی استطاعت سے محروم ہیں ان کا کیا ہوگا؟" ان کی یہ بات ختم ہوتے ہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر پھر وحی کی کیفیت طاری ہوئی۔ اس بار بھی آپؐ کا زانوئے مبارک میرے زانو پر پڑا اور میں نے وہی وزن محسوس کیا جو پہلی بار کیا تھا پھر جب آپ کے اوپر سے نزولِ وحی کی وہ کیفیت دور ہوئی تو فرمایا:

"زید! جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھو" تو میں نے پڑھا "لا یستوی القاعدون من المؤمنین" تو آپؐ نے فرمایا کہ لکھو: "غیر اولی الضرر" "کسی معذوری کے بغیر"۔ اس طرح وہ استثنا نازل ہوا جس کی تمنا حضرت ابن ام مکتوم نے کی تھی۔

باوجودیکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے عبداللہ ابن ام مکتومؓ اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو شرکتِ جہاد کی پابندی سے مستثنیٰ قرار دیا تھا، لیکن ان کا نفسِ بلند ہی معذوروں کے ساتھ بیٹھ رہنے پر رضامند نہ ہوا۔ انھوں نے جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہونے کا عزم بالجزم کر لیا۔ کیونکہ نفوسِ عالیہ مہماتِ امور کو چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے کاموں پر قانع نہیں ہوا کرتے چنانچہ اسی روز انھوں نے طے کر لیا کہ وہ کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ انھوں نے میدانِ جنگ میں اپنے لئے ڈیوٹی بھی متعین کر لی تھی وہ کہتے تھے کہ "مجھے دو صفوں کے درمیان

کھڑا کرکے علم میرے ہاتھ میں دے دو۔ میں اسے بلند رکھوں گا اور اس کی حفاظت کروں گا کیونکہ نابینا ہونے کی وجہ سے میں بھاگ نہیں سکتا۔"

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ۱۴ھ میں ایرانیوں کے ساتھ ایک ایسی فیصلہ کن جنگ کا عزم مصمم کیا جو ان کی حکومت کو زیر و زبر کر دے اور ان کی سلطنت کا خاتمہ کر کے عساکرِ اسلام کے لئے آگے بڑھنے کا راستہ صاف کر دے۔ اس لئے انھوں نے اپنے صوبائی گورنروں کو ہدایت دی:

"ہر اس شخص کو جلد از جلد میرے پاس بھیج دو جس کے پاس اسلحہ یا گھوڑا یا قوتِ شجاعت یا جنگی سوجھ بوجھ ہو۔"

اور مسلمانوں نے فاروقِ اعظمؓ کی اس پکار پر لبیک کہا اور وہ جوق در جوق مرکزِ خلافت مدینہ کی جانب امڈ پڑے۔ ان لبیک کہنے والوں میں نابینا مجاہد حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ بھی تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس لشکر کی قیادت حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سپرد کی اور انھیں ہدایات ونصائح کے ساتھ رخصت کیا۔ جب یہ لشکر قادسیہ کے مقام پر پہنچ کر خیمہ زن ہوا اور جنگ کا دن آیا تو حضرت ابن ام مکتومؓ زرہ پہن کر پورے طور پر تیار ہو کر نکلے اور خود کو مسلمانوں کی علمبرداری اور اسکی حفاظت یا اسکی حفاظت کرتے ہوئے جان دے دینے کے لئے پیش کیا۔

دونوں فوجوں میں تین دن تک سخت خونریز معرکہ آرائی ہوتی رہی۔ دونوں فریق ایک دوسرے سے اس طرح ٹکرائے کہ جنگوں کی تاریخ سے اس کی مثال بمشکل پیش کی جا سکتی ہے۔ آخر کار تیسرے روز مسلمانوں کی زبردست فتح کے ساتھ اس جنگ کا خاتمہ ہوا اور دنیا کی عظیم ترین سلطنت کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا اور کفر و بت پرستی کی سرزمین پر توحید کا جھنڈا لہرانے لگا۔

اس فتحِ مبین کی قیمت ہزاروں شہداء نے اپنے خون سے ادا کی تھی۔ ان شہیدوں میں حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ بھی تھے۔ وہ میدانِ جنگ میں اس حال میں پڑے ہوئے پائے گئے کہ اپنے خون میں لت پت، علمِ اسلام کو اپنے کندھے سے چمٹائے ہوئے تھے۔ ••

قسط ۲

قدامت پرستی کا کیسا جنون ہے یہ!؟

ڈاکٹر محمد عنایت اللہ سبحانی

امام شاطبی کی سیر حاصل گفتگو

امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

”حدیث کے بارے میں یہ تو کہا جائے کہ وہ اللہ کی طرف سے وحی تھی یا یہ کہا جائے کہ کتاب وسنت کی شکل میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس جو وحی تھی موجود تھی اس کی روشنی میں وہ آپ کے اجتہادات تھے۔ ان دونوں باتوں میں سے جو بات بھی کہی جائے، کسی بھی شکل میں حدیث کتاب الٰہی کے متناقض نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم اپنے جی سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ آپ جو کچھ کہتے تھے وہ وحی ہوتی تھی۔ اب اگر آپ کے متعلق یہ کہا جائے کہ آپ سے بھی غلطی کا امکان تھا، تو ساتھ ہی یہ بھی ماننا ہوگا کہ آپ کسی غلطی پر زیادہ دیر باقی نہیں رہ سکتے تھے، یہ غلطی تو آپ اس غلطی سے نکل کر آپ صحیح بات کی طرف پلٹ آتیں اور جب یہ بات طے ہو گئی کہ آپ کسی غلطی پر باقی نہیں رہ سکتے تھے تو یہ بات بدرجہ اولیٰ ماننی ہوگی کہ آپ اپنے اجتہادات کوئی ایسا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے جو کتاب الٰہی کے خلاف ہو۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ سنت میں کوئی ایسی بات ہو جو نہ قرآن کے خلاف ہو نہ موافق، بلکہ ایسی بات بھی ہو سکتی ہے جس کے سلسلے میں قرآن بالکل خاموش ہو۔ مگر یہ اسی وقت تک ہو گا جب تک اس کے خلاف کوئی واضح دلیل نہ مل جائے۔

بصورت دیگر ہر حدیث کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق ہو جیسا کہ حدیث مذکور[1] میں اس کی تصریح موجود ہے۔“ تو اس حدیث کی سند صحیح ہو یا نہ ہو لیکن اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے۔

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو

امام طحاوی نے اپنی کتاب ”مشکل الحدیث“ میں اسی کے ہم معنی ایک اور روایت نقل کی ہے وہ یہ ہے:

عن عبد الملك بن سعيد بن سويد الانصاري عن ابي حميد و ابي اسيد ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: اذا سمعتم الحديث عني تعرفه قلوبكم وتلين له اشعاركم وابشاركم وترون انه منكم قريب فانا اولاكم به واذا سمعتم بحديث عني تنكره قلوبكم وتنفر منه اشعاركم وابشاركم وترون انه منكم بعيد فانا ابعدكم منه۔	عبد الملک بن سعید بن سوید انصاری نے ابو حمید اور ابو اسید سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میرے حوالے کوئی ایسی حدیث سنو جس سے تمہارے دل انسیت محسوس کریں اور تمہارے بال اور تمہارے جسم پر اس سے رقت طاری ہو جائے، اور تم اسے اپنے سے قریب محسوس کرو، تو میں اس کا تم سب سے زیادہ سزاوار ہوں گا۔ اور اگر تم میرے حوالے سے کوئی ایسی حدیث سنو جس سے تمہارے دل اجنبیت محسوس کریں اور تمہارے بال اور تمہارے جسم اس سے متوحش ہوں اور تم محسوس کرو کہ وہ قابل رد ہے تو میں اس سے تم سب سے زیادہ دور ہوں گا۔

انہی عبد الملک نے عباس بن سہل سے روایت کی ہے کہ حضرت ابی بن کعب ایک مجلس میں تشریف

بقیہ گزشتہ صفحہ کا حاشیہ:

[1] حدیث مذکور سے مراد یہ حدیث ہے جس کا ذکر مصنف رحمۃ اللہ علیہ پہلے کر چکے ہیں: ما اتاكم عني فاعرضوه على كتاب الله فان وافق كتاب الله فانا قلته وان خالف كتاب الله فلم اقله انا وكيف اخالف كتاب الله وبه هداني الله۔

”میرے حوالے سے جو بات بھی تمہارے پاس آئے اسے کتاب الٰہی کی روشنی میں پرکھو۔ اگر وہ کتاب الٰہی کے مطابق ہو تو وہ میری بات ہوگی اور اگر اس کے خلاف ہو تو وہ میری کہی ہوئی بات نہیں ہوگی۔ آخر کتاب الٰہی کی مخالفت میں کیسے کر سکتا ہوں جبکہ اسی کے ذریعہ اللہ نے مجھے ہدایت دی ہے۔“

رکھتے تھے۔ لوگ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے حوالے بہت سی نرم اور سخت باتیں بیان کر رہے تھے ابی بن کعب چپ چاپ سنتے رہے۔ پھر لوگ اپنی باتیں کر چکے تو فرمایا:

اذا حدثتم حديثا ينفعكم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم يعرفه القلب ويلين له الجلد وترجون عنده فصدقوا بقول رسول الله صلى الله عليه وسلم فان رسول الله لا يقول الا الخير۔

"اے لوگو! جب تم کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے کوئی ایسی بات پہنچے جس سے دل انسیت محسوس کرے اور جسم پر رقت طاری ہو جائے اور تمہارے اندر کچھ جذبہ پیدا ہو تو الیقین کرو کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا قول ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خیر کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتے"۔

امام طحاوی نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ اللہ تعالٰی نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے:

انما المؤمنون الذين اذا ذكر الله وجلت قلوبهم۔ "صحیح معنوں میں مومن وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل لرز اٹھیں"۔

نیز فرمایا ہے: مثاني تقشعر منه جلود الذين يخشون ربهم۔ "دہرائی ہوئی، اس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں"۔

نیز فرمایا ہے: واذا سمعوا ما انزل الى الرسول ترى اعينهم تفيض من الدمع۔ "اور جب وہ سنتے ہیں وہ آیتیں جو رسول کی طرف اتاری گئی ہیں تو تم دیکھتے ہو ان کی آنکھوں کو کہ آنسوؤں سے ابل رہی ہیں"۔

تو اللہ تعالٰی نے ان آیات میں اہل ایمان کی وہ کیفیت بیان فرمائی ہے جو اس کا کلام سن کر ان پر طاری ہوتی ہے اور وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے جو حدیثیں بیان کرتے تھے وہ بھی اسی کی جنس سے تھیں، اس لئے کہ سب حدیثیں بھی اللہ ہی کی جانب سے ہیں۔ تو اب اگر حدیث کو سن کر بھی ان پر وہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو قرآن کو سن کر ہوتی ہے تو یہ چیز اس حدیث کی صحت وصداقت کی دلیل ہوگی اور اگر کسی حدیث کو سن کر ان کی کیفیت اس کے برعکس ہوتی ہے تو اس حدیث کے سلسلے میں توقف ضروری ہوگا۔ اسی طرح جو کچھ انھوں نے فرمایا ہے اس

سے یہ بات لازم آتی ہے کہ حدیث اپنے مفہوم میں قرآن کے مطابق ہی ہوگی، وہ اس سے مخالف نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر وہ مخالف ہوگی تو اسے سن کر جسموں کے رونگٹے کھڑے ہوں گے نہ دلوں میں رقت پیدا ہوگی۔ ظاہر ہے کوئی چیز اپنی ضد کی ہم شکل تو ہو نہیں سکتی۔

امام طحاوی نے حضرت ابو ہریرہؓ کے واسطے سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بھی نقل کی ہے:

اذا حدثتم عني حديثا تعرفونه ولا تنكرونه فصدقوا به قلته او لم اقله فاني اقول ما يعرف ولا ينكر واذا حدثتم عني حديثا تنكرونه ولا تعرفونه فكذبوا به فاني لا اقول ما ينكر ولا يعرف۔

"جب میرے حوالے کوئی بھی حدیث بیان کی جائے جس سے تم انسیت محسوس کرتے ہو اور اس میں کوئی اجنبیت نہ معلوم ہوتی ہو تو اس کو مان لو، میں نے اسے کہا ہو یا نہ کہا ہو، کیونکہ میں وہی بات کہہ سکتا ہوں جس سے انسیت معلوم ہو، اجنبیت نہ محسوس ہو اور جب میرے حوالے سے کوئی ایسی حدیث بیان کی جائے جس سے تمہیں اجنبیت معلوم ہوتی ہو، انسیت نہ محسوس ہوتی ہو تو اسے جھٹلا دو کیونکہ میں ایسی بات نہیں کہہ سکتا جس سے وحشت ہو، انسیت نہ محسوس ہو"۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کوئی روایت اگر اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت کے مطابق ہو، اس طور سے کہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ کتاب وسنت میں موجود ہو تو اس کو قبول کرنا واجب ہوگا کیونکہ اگر یہ ثابت نہ ہو سکے کہ آپ نے وہ بات ان لفظوں میں فرمائی ہے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اسی طرح کی بات آپ نے دوسرے لفظوں میں تو فرمائی ہے۔ اس طرح اس کی نوعیت بالکل ایسی ہی ہوگی جیسے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے کلام کی تشریح کسی عجمی کے لئے خود اس کی زبان میں کی جائے۔ ظاہر ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

لیکن اگر کوئی حدیث قرآن وسنت کے مخالف ہو تو واجب ہے کہ وہ رد کر دی جائے اور یہ سمجھا جائے کہ وہ آپ کی فرمائی ہوئی نہیں ہے۔

اس ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ حدیث کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں ان کا طریقہ ہی صحیح طریقہ ہے۔ اگر مذکورہ بالا روایات

نہیں لیکن اگر سنداً ان کی صحت ثابت ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ہمارے لئے کہ ان میں جو بات کہی گئی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ ؎[1]

یہ ہیں وہ بنیادی اصول جو علمائے امت نے کسی حدیث کی صحت کو جانچنے کے لئے مقرر کئے ہیں۔

ظاہر ہے کسی حدیث کی صحت کے لئے بس اتنی ہی بات کافی نہیں ہو سکتی کہ وہ کتب حدیث یا کتب تاریخ یا کتب مغازی و سیر میں سے کسی ایک میں یا ایک سے زائد کتابوں میں جگہ پا گئی ہے۔ اور نہ یہ بات کافی ہو سکتی کہ ہم اس کے رجال کی تحقیق کر کے اس کی سند کی طرف سے اطمینان کرلیں۔ ہمارے لئے سند کی صحت اور چیز ہے، اور متن کی صحت اور چیز ہے اور دونوں میں سے کسی ایک کی صحت دوسرے کی صحت کو مستلزم نہیں ہے۔

یہ عین ممکن ہے کہ ایک روایت سند کے اعتبار سے تو انتہائی مضبوط مگر متن کے لحاظ سے کمزور اور قابل رد ہو۔

سند مضبوط اور متن کمزور ہونے کی ایک مثال

اپنی اس بات کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں:

شیخین نے حضرت عبداللہ بن ابی ملیکہ کی ایک روایت کی تخریج کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: کہ مکہ میں حضرت عثمان بن عفان کی ایک بیٹی کا انتقال ہو گیا۔ اس موقع پر ہم ان کے ہاں گئے۔ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی گئے۔ وہاں میں ان دونوں بزرگوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ میں ان دونوں میں سے ایک کے پاس جا کر بیٹھ گیا پھر دوسرے صاحب آئے اور وہ میرے پہلو میں بیٹھ گئے۔ پھر ایسا ہوا کہ عبداللہ بن عمر نے حضرت عثمان کے صاحبزادے عمرو سے کہا جو انہی کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھے ہوئے تھے: "تم لوگوں کو رونے سے روکتے نہیں ہو؟ کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ علیہ (میت پر عذاب ہوتا ہے جب اس کے گھر والے اس پر روتے ہیں)۔" یہ سن کر حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا: حضرت عمر بھی اسی

---

[1] الموافقات فی اصول الاحکام ۴/۱۵—۱۶

بات کو بیان فرمایا کرتے تھے۔ مزید بیان کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا: میں حضرت عمر کے ساتھ مکہ سے چلا یہاں تک کہ جب صحرا میں پہنچ گئے تو ایک درخت کے سایہ میں ایک قافلہ نظر آیا۔ حضرت عمر نے فرمایا: جاؤ دیکھو، وہ کون لوگ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: میں نے جا کر دیکھا تو وہ صہیب رضی اللہ عنہ تھے۔ میں نے آکر حضرت عمر کو بتایا۔ انھوں نے فرمایا: انھیں میرے پاس بلا لاؤ۔ میں صہیب کے پاس دوبارہ گیا اور میں نے کہا: چلئے، امیر المؤمنین سے مل لیجئے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے مزید فرمایا: پھر جب حضرت عمر شہید ہوئے تو صہیب یہ کہہ کر رونے لگے، ہائے میرے بھائی ہائے میرے ساتھی! حضرت عمر نے سنا تو فرمایا: صہیب! تم مجھ پر رو رہے ہو؟ جبکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ان المیت لیعذب ببعض بکاء اھلہ علیہ (کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میت کے گھر والے روتے ہیں تو اس سے میت پر عذاب ہوتا ہے)۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں: حضرت عمر کا انتقال ہو گیا تو بعد میں میں نے حضرت عائشہ سے اس کا تذکرہ کیا۔ حضرت عائشہ نے یہ سن کر فرمایا: رحم اللہ عمر، واللہ ما حدث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (خدا حضرت عمر پر رحم فرمائے۔ بخدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا ہے)۔

اور مسلم کی روایت میں ہے:

یرحم اللہ عمر، لا واللہ ما حدث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ان اللہ یعذب المؤمن ببکاء احد ولکن قال: ان اللہ یزید الکافر عذاباً ببکاء اھلہ علیہ۔

"اللہ حضرت عمر پر رحم فرمائے۔ بخدا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ اللہ مومن کو کسی کے رونے سے عذاب دیتا ہے، بلکہ آپ نے فرمایا ہے: اللہ کافر کو زیادہ عذاب دیتا ہے جب اس کے گھر والے اس پر روتے ہیں۔"

پھر حضرت عائشہ نے فرمایا: حسبکم القرآن (ولا تزر وازرۃ وزر اخری) اس سلسلے میں قرآن تمہارے لئے کافی ہے۔ وہ کہتا ہے: کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں: بخدا! یہ سن کر حضرت ابن عمرؓ کچھ نہیں بولے۔ [1]

یہ ایک نہایت واضح شاہد ہے اس بات کی کہ سند کے اعتبار سے کوئی روایت انتہائی مضبوط ہوتے ہوئے بھی اپنے متن کے لحاظ سے قابل رد ہو سکتی ہے۔ اس روایت میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہؓ کے درمیان صرف دو واسطے تھے۔ ایک سیدنا عمر بن خطابؓ تھے اور دوسرے سیدنا عبداللہ بن عباس تھے۔ اور یہ دونوں ہی واسطے سورج سے زیادہ روشن اور پہاڑ سے زیادہ مضبوط تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں واسطوں سے جو بات حضرت عائشہؓ کو پہونچی تھی وہ فی نفسہ کمزور تھی۔ اس لئے انھوں نے اسے رد کر دیا اور خود ان کی طرف سے صفائی پیش کرتے ہوئے فرمایا: انکم لتحدثونی عن غیر کاذبین ولا مکذبین ولکن السمع یخطئ۔ "تم لوگ دو ایسے بزرگوں کے حوالے سے مجھ سے بیان کر رہے ہو جو نہ جھوٹے ہیں اور نہ انھیں جھٹلانے کی کوئی جرأت کر سکتا ہے، لیکن بہرحال سننے میں غلطی ہو سکتی ہے۔" [2]

مولانا مودودی کی حقیقت افروز تحریر

روایات کے رد و قبول کے سلسلے میں ہمیشہ سے محققین امت کا یہی اصول رہا ہے

اور اسی اصول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مفکر اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

"ہم اس سے پہلے بھی بارہا کہہ چکے ہیں اور یہاں پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ کوئی روایت خواہ اس کی سند آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہو، ایسی صورت میں قابل قبول نہیں ہو سکتی جبکہ اس کا متن اس کے غلط ہونے کی کھلی کھلی شہادت دے رہا ہو اور قرآن کے الفاظ، سیاق و سباق، ترتیب ہر چیز اسے قبول کرنے سے انکار کر رہی ہو۔

---

[1] ملاحظہ ہو: الاجابۃ لایراد ما استدرکتہ عائشۃ علی الصحابۃ: امام بدر الدین زرکشی تحقیق و تعلیق: سعید افغانی: ۹۶-۹۷

[2] صحیح مسلم: ۴۲/۳

آگے مزید فرماتے ہیں:

(خدا کی پناہ اس روایت پرستی سے جو محض سند کا اتصال یا راویوں کی ثقاہت یا طرق روایت کی کثرت دیکھ کر کسی مسلمان کو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کے بارے میں ایسی سخت باتیں بھی تسلیم کرنے پر آمادہ کر دے) [1]

پھر جہاں ایسا ہوتا ہے کہ ایک روایت سند کے اعتبار سے تو انتہائی مضبوط مگر متن کے لحاظ سے نہایت کمزور اور قابل رد ہوتی ہے وہیں بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک روایت سند کے اعتبار سے تو انتہائی کمزور مگر متن کے لحاظ سے وہ آفتاب کی طرح روشن ہوتی ہے۔

سند کمزور اور متن روشن ہونے کی مثال

مثال کے طور پر یہاں ہم اسی روایت کو پیش کر سکتے ہیں جو مختلف الفاظ میں پیچھے گزر چکی ہے اور جس پر امام شافعی کی سیر حاصل گفتگو بھی گزر چکی ہے۔ وہ روایت یہ ہے:

اذا روی لکم عنی حدیث فاعرضوہ علی کتاب اللہ تعالیٰ فان وافقہ فاقبلوہ والا فردوہ۔	جب تمہارے سامنے میرے حوالے سے کوئی حدیث بیان کی جائے تو اسے کتاب اللہ کی کسوٹی پر پرکھو اگر وہ اس کے مطابق ہو تو لے لو ورنہ رد کر دو۔

یہ روایت اپنی سند کے اعتبار سے چاہے کتنی ہی کمزور ہو مگر اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ انتہائی محکم ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ احادیث کو پرکھنے کے لئے اس سے زیادہ مضبوط اور قابل اعتماد کسوٹی اور کوئی نہیں ہو سکتی اور اگر ہمارے محدثین کرام نے یہ کسوٹی سامنے رکھی ہوتی تو احادیث کی بحث و تحقیق اور روایات کی چھان بین کا معاملہ بہت حد تک آسان ہو جاتا۔

اب کیا ہم چودھری بہادر سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ احادیث کو سمجھنے اور جانچنے پرکھنے کے ان مسلّمہ اصولوں کے علاوہ امام فراہی کے ہاں اور کون سے خود ساختہ اصول ہیں جن کی وجہ سے وہ اس قدر جامے سے باہر ہو گئے ہیں؟!

یہ تو چودھری بہادر کی عائد کردہ دفعہ ۲ کی ایک شق پر گفتگو ہوئی۔ دوسری شق پر گفتگو

---

[1] تفہیم القرآن، سورۂ حج ۲۴۳/۳ — ۲۴۴

کرنے کے لئے مناسب ہوگا کہ وہ پوری ذخیرہ حدیث میں مستحضر کرلی جائے

آنجناب فرماتے ہیں:

(جو احادیث کو سمجھنے اور جانچنے پرکھنے کے اجتماعی طور پر مسلم اصولوں کو چھوڑ کر اپنے کچھ خود ساختہ اصول رکھتے ہیں اور جن کے ذریعہ وہ احادیث کے بہت بڑے ذخیرے کا اعتقاداً اور عملاً انکار کرتے ہیں)

غلطہائے مضامین مت پوچھ

اس عبارت سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ چودھری بہادر علم و تحقیق کے میدان میں بالکل نووارد ہیں۔ انھیں یہی پتہ نہیں ہے کہ انکار حدیث کیا ہے اور منکرین حدیث کن لوگوں کو کہتے ہیں۔ اگر ایک شخص اصولی حیثیت سے حدیث کی تشریعی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتا اور آپ کے قول و فعل کو اپنے لئے واجب الاتباع سمجھتا ہے وہ آپ سے بے پناہ محبت رکھتا اور آپ کی ایک ایک ادا پر جان دیتا ہے اور یہی محبت و عقیدت اسے اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ صحیح احادیث کی چھان بین کرے اور جو غلط باتیں آپ کے نام سے شہرت پاگئی ہیں ان کی برملا تردید کرے۔

وہ اس تصور سے کانپ اٹھتا ہے کہ کوئی ایسی بات آپ کی ذات گرامی کی طرف منسوب کی جائے جس کی صحت پر اس کا دل مطمئن نہیں ہے، نہ صرف یہ کہ مطمئن نہیں ہے بلکہ انتہائی ٹھوس علمی دلائل کی روشنی میں وہ اس کو غلط سمجھتا ہے۔

وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ان وعیدوں کی سنگینی کو پوری شدت سے محسوس کرتا ہے جس کو عام لوگوں نے بدقسمتی سے محسوس نہیں کیا۔ مثال کے طور پر آپ نے فرمایا:

كفى بالمرء كذبا أن يحدث بكل ما سمع۔ [1]

آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ جو کچھ بھی کان سے سنے اسے بیان کرنے لگے۔

اسی طرح حضرت انس بن مالک کے سلسلے میں روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا:

[1] صحیح مسلم۔ بشرح النووی ۱/۷۳

انه ليمنعني أن أحدثكم حديثا كثيرا أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: من تعمد علي كذبا فليتبوأ مقعده من النار۔ [1]

میں تم سے زیادہ حدیثیں اس وجہ سے نہیں بیان کرتا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جس نے دیدہ و دانستہ میری طرف کوئی ایسی بات منسوب کی جو میں نے نہیں کہی ہے، تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

ایسا کوئی شخص جو اس طرح کی وعیدوں کی بنا پر احادیث کے معاملے میں محتاط روش اختیار کرتا ہے اور جب بھی کوئی حدیث اس کے سامنے آتی ہے علم و تحقیق کے بے لاگ اصولوں پر اسے پرکھتا ہے اور جو حدیث یا جو روایت ان پر پوری نہیں اترتی اس کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے، کیا ایسے شخص کو منکر حدیث کہا جا سکتا ہے؟ کیا احادیث کی تحقیق و تمحیص اور احادیث کا انکار دونوں ہم معنی الفاظ ہیں؟

کیا محدثین بھی منکرین حدیث تھے؟

اور اگر انکار حدیث کا یہی مفہوم ہے تو کیا ہمارے تمام محدثین عظام بھی اسی صف میں کھڑے ہوئے نہیں نظر آتے ہیں؟

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آتا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

"سات لاکھ سے زائد حدیثیں ہیں جو صحیح سند کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں۔"

اور ان کی مسند انھیں پڑھ کر سنائی گئی تو فرمایا: "ساڑھے سات لاکھ احادیث سے زائد حدیثوں میں سے انتخاب کرکے میں نے یہ کتاب تیار کی ہے۔"

جب کہ صورت حال یہ ہے کہ مسند احمد کی احادیث کی مجموعی تعداد چالیس ہزار تک پہنچتی ہے اور اگر مکررات کو نہ شمار کیا جائے تو صرف تیس ہزار رہ جاتی ہے۔

اسی طرح صحیحین کی احادیث کی مجموعی تعداد، اگر مکررات کو نہ شمار کیا جائے، تو تقریباً چار ہزار ہوتی ہے۔

[1] صحیح مسلم، بشرح النووی۔ ۱/۹۶

ظاہر ہے یہ چار ہزار روایتیں لاکھوں روایتوں کے اندر سے چھانٹی گئی ہیں۔ چنانچہ امام بخاریؒ کا مشہور قول ہے:

خرجت صحیحی هذا من زهاء ست مائة الف حدیث۔ "میں نے صحیح احادیث کا یہ مجموعہ تقریباً چھ لاکھ حدیثوں کے اندر سے تیار کیا ہے۔"[1]

اب سوال یہ ہے کہ اگر ان محدثین عظام نے لاکھوں حدیثوں کو نظر انداز یا قلم زد کر دیا اور ان لاکھوں میں سے بس چند ہزار حدیثیں ان کی کتابوں میں جگہ پا سکیں تو کیا اس کی بنا پر وہ منکرین حدیث یا منکرین سنت قرار پائیں گے؟

کیا چودھری صاحب ان محدثین عظام کو بھی اپنے اسی پیمانے سے ناپیں گے جو انھوں نے امام فراہی اور ان کے جیسوں کے لئے تراشا ہے یا ان کے لئے کوئی دوسرا پیمانہ تلاش کریں گے؟!

آخر ان لوگوں نے بھی تو احادیث کے ایک بہت بڑے ذخیرے کو ماننے سے انکار کر دیا تھا! چودھری صاحب نے لکھنے کو تو یہ بات لکھ دی لیکن یہ نہیں سوچا کہ اس کی زد کہاں کہاں پڑتی ہے۔

ایک شبہے کا جواب

ہو سکتا ہے اس موقع پر یہ کہا جائے کہ اگر محدثین عظام نے لاکھوں میں سے بس چند ہزار حدیثیں منتخب کیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ انھوں نے بقیہ حدیثوں کو رد کر دیا ہے، بلکہ ان کے پیش نظر صرف یہ تھا کہ صحیح ترین احادیث کا ایک انتخاب تیار ہو جائے۔

یہ بات کچھ لوگوں کے بارے میں صحیح ہو تو ہو مگر سب کے بارے میں صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر واقعۃً صورت حال یہی ہوتی تو امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اپنی مسند کے بارے میں اس طرح کے الفاظ نہ فرماتے:

ما اختلف المسلمون فیه من الحدیث فارجعوا الیه فما لم تجدوا فیه فلیس بحجة۔[2]

"مسلمانوں میں کسی حدیث کے سلسلے میں اختلاف ہو جائے تو اس کی طرف رجوع کرو اور جو حدیث اس میں نہ ملے وہ حجت نہیں ہے۔"

۱۔ جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول از علامہ ابو الفیض محمد بن محمد بن علی الفارسی (متوفی ۸۳۷ھ) ص ۱۶

۲۔ جواہر الاصول ص ۱۵

کیا فقہاء امت منکرین حدیث تھے؟

پھر یہ بات ان محدثین عظام تک ہی محدود نہیں کہ اس امت کے مایہ ناز علماء و فقہاء ہمیشہ روایات کی چھان بین کرتے رہے ہیں حتیٰ کہ بہت سی وہ روایات جو محدثین کے درمیان مشہور اور شبہ متواتر کے درجہ میں سمجھی جاتی رہی ہیں، ان پر بھی کلام کرتے رہے ہیں مگر اس کے باوجود کسی کی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ انھیں انکار سنت یا انکار حدیث کا الزام دے سکے۔

یہاں بہت زیادہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں اس لئے ہم بس تین مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

(۱) ایک مشہور حدیث ہے: من مس ذکرہ فلیتوضأ "جو شخص اپنا ذکر چھوئے وہ وضو کرے۔"

اس حدیث کے بارے میں مشہور کتاب "اصول الفقہ" کے مصنف علامہ محمد الخضری بک لکھتے ہیں: "یہ حدیث متواتر ہے۔ سترہ صحابہ نے اس کی روایت کی ہے اور بیشتر ائمہ حدیث نے اس کی تخریج کی ہے۔ جن صحابہ یا صحابیات نے اس کی روایت کی ہے ان کے نام یہ ہیں:

(۱) حضرت بسرہ (۲) حضرت جابر (۳) حضرت ام حبیبہ (۴) حضرت سعد (۵) حضرت ابو ہریرہ (۶) حضرت ام سلمہ (۷) حضرت زید بن خالد الجہنی (۸) حضرت ابن عمر (۹) حضرت عائشہ (۱۰) حضرت ابن عباس (۱۱) حضرت اروی بنت انیس (۱۲) حضرت ابی (۱۳) حضرت انس (۱۴) حضرت قبیصہ (۱۵) حضرت معاویہ بن حیدۃ (۱۶) حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اور ان میں سب سے زیادہ صحیح طریق سے جو روایت آتی ہے وہ حضرت بسرہ بنت صفوان کی ہے جیسا کہ امام بخاری نے اس کی تصریح کی ہے۔

نیز امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مؤطا میں حضرت سعد اور حضرت عبد اللہ بن عمر کے بارے میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ یہ دونوں حضرات مس ذکر سے وضو کا حکم دیا کرتے تھے۔"[1]

ایک طرف یہ روایت اور اس کا یہ درجہ ملاحظہ ہو دوسری طرف مشہور حنفی عالم امام اسحٰق بن ابراہیم شاشی (متوفی ۳۲۵ھ) کے یہ الفاظ بھی اس کے سلسلے میں ملاحظہ ہوں وہ فرماتے ہیں:

۱۔ اصول الفقہ ص ۲۵۹

لنظیر العرض علی الکتاب فی حدیث مس الذکر فیما یروی عنہ علیہ السلام من مس ذکرہ فلیتوضأ و نعرضہ علی الکتاب فنخرجہ مخالفا لقولہ تعالیٰ (فیہ رجال یحبون ان یتطھروا) فانھم کانوا یستنجون بالاحجار ثم یغسلون بالماء ولو کان مس الذکر حدثا لکان ھذا تنجیسا لا تطھیرا علی الاطلاق۔ حدیث کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنے کی مثال مس ذکر کی وہ حدیث ہے جس میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے یہ روایت کی گئی ہے کہ جو اپنا ذکر چھوئے وہ وضو کرے۔ اس حدیث کو ہم نے قرآن کی کسوٹی پر پرکھا تو وہ اس ارشاد الٰہی کے خلاف نکلی: (فیہ رجال یحبون ان یتطھروا) کیونکہ وہ لوگ پتھروں سے استنجا کرتے تھے پھر پانی سے دھوتے تھے۔ تو اگر ذکر کا چھونا کوئی نجاست ہوتی تب تو یہ ہر صورت میں نجس کرنا ہوا، نہ کہ پاک کرنا۔ ۱

ایک مشہور روایت جس کے بارے میں علامہ محمد الخضری بک کی یہ تحقیق ہے کہ وہ حدیث متواتر ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کو قرآن کے آئینہ میں دیکھتے ہیں اور قرآن کے مطابق نظر نہ آنے کی صورت میں اسے رد کر دیتے ہیں۔

پھر یہ تنہا امام شافعی کی بات نہیں بلکہ اس سلسلے میں تمام فقہائے احناف کا یہی موقف ہے۔

(۲) ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مشہور روایت ہے: فتلت قلائد ھدی النبی ﷺ ثم اشعرھا وقلدھا۔ "میں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی قربانی کے جانوروں کے قلادے بٹ کر تیار کئے۔ پھر آپ نے ان جانوروں کا اشعار کیا اور انھیں وہ قلادے پہنائے"۔ ۲

اشعار سے مراد یہ ہے کہ اونٹ کے کوہان کی دائیں یا بائیں جانب کو اس طرح سے چیر پھاڑ دیا جائے کہ وہ اچھی طرح سے خون آلود ہو جائے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ جانور دور سے ہی

۱ اصول الشاشی ص ۷۶ ـ ۷۷

۲ صحیح البخاری، کتاب الحج: باب اشعار البدن

پہچان لیا جائے کہ وہ قربانی کا جانور ہے۔

یہ روایت نہ صرف یہ کہ شیخین کی ہے بلکہ دوسرے ائمہ حدیث نے بھی اپنی جوامع وسنن میں اسکی تخریج کی ہے چنانچہ اسی بنا پر عام ائمہ وفقہاء اونٹ اور گائے کے اشعار کو سنت قرار دیتے ہیں جبکہ ان کی قربانی کی نیت کر لی جائے۔ لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس مقبول و مشہور حدیث کو یک قلم رد کر دیتے ہیں، وہ "اشعار" کو "مثلہ" کہتے اور اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ ۱ اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہ جانور کو اذیت پہنچانا ہوا جس کی شریعت میں ممانعت آئی ہے۔

(۳) ایک تیسری مثال ملاحظہ ہو:

صحیح مسلم کی مشہور روایت ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے طریق سے آئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضی بیمین وشاھد۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک قسم اور ایک گواہ کی گواہی پر فیصلہ فرمایا۔ ۲

پھر امام مسلم تک ہی یہ بات محدود نہیں بلکہ دوسرے کبار محدثین نے بھی اس روایت کی تخریج کی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: (سنن ابی داؤد، باب القضاء بالیمین والشاہد ۳۰۸/۳ ـ الجامع للترمذی باب ما جاء فی الیمین مع الشاہد ۶۱۹/۶ ـ سنن ابن ماجہ باب القضاء بالشاہد والیمین ۷۹۳/۲ ـ مسند احمد ۳۲۳-۳۱۵/۱ و ۳۰۵/۳)

ایک ایسی روایت جس کی اتنے سارے محدثین نے توثیق کی ہے، ائمہ احناف اس کو یہ کہہ کر یک قلم رد کر دیتے ہیں کہ یہ آیت (واستشھدوا شھیدین من رجالکم الخ) سے ٹکراتی ہے کیونکہ اس میں دو گواہوں کی شرط رکھی گئی ہے اور اس روایت کو ماننے کی صورت میں یہ شرط پوری نہیں ہوتی۔ ۳

۱ ملاحظہ ہو: المغنی لابن قدامی ۵۴۹/۳

۲ " " باب القضاء بالیمین والشاہد ۱۳۳۷/۳

۳ " " احکام القرآن، امام ابوبکر جصاص باب الشاہد والیمین ۵۱۴/۱

یہاں پھر وہی سوال سامنے آتا ہے کہ ان سب لوگوں کے بارے میں جو دوہری معیار کیا فتویٰ دیا جائے گا؟ کیا ان سب لوگوں کو بھی وہ منکرین حدیث اور منکرین سنت قرار دیں گے؟ جس طرح سے کہ وہ اس سے پہلے امام فراہی اور ان کے شاگردوں کو قرار دے چکے ہیں یا ان لوگوں کے لئے ان سے الگ کوئی اور نیا نام تلاش کریں گے؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے جس کے ذریعے سے لوگوں کو غلط فہمی میں ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے ورنہ احادیث کی تحقیق اور بحث و تمحیص کا نام انکار حدیث نہیں۔

انکار حدیث تو نام ہے اصولی طور پر احادیث کو نہ ماننے کا۔ ان کی دینی اور تشریعی حیثیت کو تسلیم نہ کرنے کا۔ سنت رسول کو سرے سے واجب الاتباع نہ سمجھنے کا۔ آپ کے قول و فعل اور آپ کے اسوے کو حجت نہ گرداننے کا۔ جبکہ یہاں پر کسی حدیث کو نہ ماننے کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ تحقیق کے معیاروں پر پوری نہیں اترتی بلکہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اصولی طور پر واجب الاتباع اور واجب التسلیم سمجھی ہی نہیں جاتی۔

احادیث تو امام فراہیؒ کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک تھیں

اب دیکھنا چاہئے کہ کیا امام فراہی کے ہاں بھی صورت حال یہی ہے۔ امام فراہی اپنی تفسیر کے مقدمہ میں ہی نہایت واضح لفظوں میں یہ اعلان فرماتے ہیں:

ان اول شیٔ یفسر القرآن ھو القرآن نفسه ثم بعد ذالك فهم النبي صلى الله عليه وسلم والذين معه۔ ولعمري احب التفسير عندي ما جاء عن النبي صلى الله عليه وسلم واصحابه۔ [1]

"پہلی چیز جو قرآن کی تفسیر کرتی ہے وہ خود قرآن ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا فہم ہے اور میری جان کی قسم میرے نزدیک سب سے محبوب تفسیر وہی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب سے ثابت ہو۔"

[1] فاتحہ تفسیر نظام القرآن ص ۷

اسی طرح تفسیر سورۂ فیل میں رمی جمار کی سنت پر گفتگو کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

لم اجد فی صحاح الاخبار ذکرا من سبب سنة رمی الجمار ولو ثبت فیه شیٔ من طریق الخبر لاخذنا به وقرت به العینان ولکنه لم یثبت وامر الدین لیس بهین وقال النبی صلی الله علیه وسلم کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما یسمع فعمدنا الی طریق الاستنباط فان المستنبط من الصحیح الثابت اولی بالصواب من الصریح الذی لم یثبت وقد ندب الله تعالی کثیرا الی التفکر والتوسم بالدلائل کما قال تعالی: ان فی ذلك لآیات للمتوسمین ۔ [1]

"صحیح روایات میں سنت رمی جمار کے سبب کا کوئی تذکرہ مجھے نہیں مل سکا۔ اگر حدیث کے طریق سے اس سلسلے میں کوئی چیز ثابت ہوتی تو ہم اسے اختیار کر لیتے اور اس سے ہماری دونوں آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتیں لیکن اس سلسلے میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے اور دین کا معاملہ کوئی کھیل نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ جو کچھ بھی سنے اسے بیان کرنے لگے۔ لہذا ہم نے استنباط کا راستہ اختیار کیا کیونکہ صحیح و ثابت چیز سے اگر کوئی استنباط ہو تو وہ استنباط بھی زیادہ قرین صواب ہوگا بہ نسبت اس صریح روایت کے جو پایۂ ثبوت کو نہ پہنچ رہی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے تو بار بار اور بکثرت دعوت دی ہے سوچنے اور دلائل پر غور و فکر کرنے کی۔ جیسا کہ ایک جگہ ارشاد ہے: ان فی ذلك لآیات للمتوسمین "اس میں بہت سی نشانیاں ہیں غور و فکر کرنے والوں کے لئے۔"

یہ امام فراہی کی دو عبارتیں ہیں جو بطور مثال ہم نے یہاں نقل کی ہیں۔ یہ عبارتیں اپنی بو باس اپنے رنگ و آہنگ کے لحاظ سے بالکل واضح ہیں۔ ان کو دیکھ کر کوئی نابالغ بھی آسانی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان کو لکھنے والا کوئی ایسا ہی شخص ہو سکتا ہے جو حب رسولؐ سے بالکل سرشار ہو۔ ساتھ ہی ہوش و آگہی کا دامن بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹا نہ ہو۔ وہ سوال کی

[1] تفسیر سورۂ فیل ص ۳۵

ایک ایک ادا پر جان تو دیتا ہو مگر ساتھ ہی اس کے فہم و بصیرت کی نگاہ بھی اتنی تیز نہیں کہ وہ حدیثِ رسول یا سنتِ رسولؐ کے نام پر آنے والی ہر جھوٹی سچی بات سے دھوکا کھا سکتا ہو۔

چودھری بہادر نے تفسیر سورۂ فیل کا مطالعہ کیا تھا تو کیا یہ عبارتیں ان کی نظر سے نہیں گزری تھیں؟ اور اگر یہ عبارتیں ان کی نظر سے گزر چکی تھیں تو پھر انھوں نے امانت و دیانت اور شرافت و انسانیت کے تمام تقاضوں کو کیسے پامال کیا؟ کیا چودھری بہادر کے نزدیک احترامِ حدیث کا مطلب یہی ہے کہ پتھر اور ہیرے اور جامن اور گبریلے میں کوئی امتیاز نہ کیا جائے؟

اور اگر وہ اسی نظریہ کے علمبردار ہیں تو ظاہر ہے ان کا یہ نظریہ کسی پڑھے لکھے اور غیور مسلم —

تیسری دفعہ

تیسری دفعہ جو امام فراہی اور ان کے تلامذہ پر عائد کی گئی ہے وہ یہ ہے:

"جو اجماعِ امت کے شرعاً حجت ہونے کے منکر ہیں۔"

یہاں صاف محسوس ہوتا ہے کہ چودھری بہادر نے امام فراہی اور ان کے تلامذہ پر یہ دفعہ عائد کرنے کو تو کر دی ہے مگر گزشتہ دونوں نقاط کی طرح اس نقطہ کی بابت بھی ان کی معلومات قطعاً ناکافی بلکہ صفر کے درجہ میں ہیں۔ انھیں بالکل پتہ نہیں ہے کہ اجماعِ امت کا کیا مطلب ہے۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ اس کی کتنی قسمیں ہیں، ہر ایک کے کیا احکام ہیں اور اس سلسلے میں علماءِ امت کے درمیان شروع سے کیا اختلافات رہے ہیں؟ انھیں اس سلسلے کی ذرا بھی معلومات ہوتیں تو وہ امام فراہی پر یہ دفعہ عائد کرنے کی کبھی جرأت نہ کرتے۔

لہٰذا اس سلسلے میں مزید کچھ کہنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ اس موضوع سے متعلق کچھ بنیادی باتیں یہاں پیش کر دی جائیں تاکہ معاملے کے تمام پہلو روشنی میں آجائیں اور چودھری بہادر کی "گل افشانی" کے نتیجے میں کسی کو امام فراہی کے متعلق کچھ غلط فہمی ہو سکتی ہو تو اس کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔

حجیتِ اجماع کے دلائل

اس سلسلے میں سب سے پہلا سوال جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ حجیتِ اجماع کے دلائل کی نوعیت کیا ہے؟ امام رازی اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"خود اجماع کے دلائل اس پایہ کے نہیں ہیں کہ ان سے یقین یا قطعیت کا فائدہ حاصل ہو"

لہٰذا جتنے احکام و مسائل بھی اس کے تحت سے چھوٹیں گے وہ سب بھی بدرجہ اولیٰ غیر قطعی ہوں گے۔ اجماع زیادہ سے زیادہ ظن کا فائدہ دیتا ہے اور اسی پر سب اجماع ہے کہ ظنیات کا انکار کرنے والے کی تکفیر نہیں کی جا سکتی۔[1]

ثبوتِ اجماع کی شرط

دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ثبوتِ اجماع کی شرط کیا ہے؟ امام ابو الخطاب حنبلی اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اجماع کا علم یا تو اس طرح ہو سکتا ہے کہ اجماع کرنے والوں کی باتیں ہم خود اپنے کانوں سے سن رہے ہوں یا اپنی آنکھوں سے انھیں کوئی عمل کرتے ہوئے دیکھ رہے ہوں یا ان کے سلسلے میں بذریعہ خبر ہمیں یہ اطلاع ملے کہ انھوں نے فلاں بات پر اجماع کر لیا ہے۔ یہ اطلاع کبھی تو تواتر کی شکل میں ہو سکتی ہے اور کبھی اخبارِ آحاد کی صورت میں، اور اجماع کو جاننے کے یہ دونوں ہی طریقے ہیں۔"

امام ابو حنیفہ کے بعض اصحاب اور بعض شوافع جیسے امام غزالی کا کہنا ہے کہ اجماع کی اطلاع اگر اخبارِ آحاد سے ملے گی تو وہ غیر معتبر ہوگا۔[2]

اجماع کا حکم ایک دو آدمیوں کے اختلاف کی صورت میں

ایک تیسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی زمانے کے تمام اہلِ علم ایک بات پر اجماع کر لیں اور ایک دو علماء اس سے اختلاف کریں تو وہ اجماع مانا جائے گا یا نہیں؟

اکثر فقہاء کا کہنا ہے کہ وہ اجماع معتبر نہیں ہوگا۔ البتہ امام ابن جریر، امام رازی اور ابو الحسین خیاط کی رائے ہے کہ وہ اجماع معتبر ہوگا۔ امام احمد کے ہاں بھی اسی کا اشارہ ملتا ہے۔[3]

اجماع کا حکم فاسق اور گمراہ لوگوں کے اختلاف کی صورت میں

ایک چوتھا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

---

[1] المحصول فی علم اصول الفقہ ۲/۱/۲۹۸

[2] التمہید فی اصول الفقہ ۳/۳۲۲

[3] التمہید ۳/۲۶۰—۲۶۱

کسی مسئلہ میں اگر علماء حق کا اجماع ہو جائے مگر فاسق اور گمراہ لوگ اس سے اتفاق نہ کریں تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟ وہ اجماع معتبر ہوگا یا قابل رد ہوگا؟

امام ابوالخطاب حنبلی اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

ہمارے شیخ کا خیال ہے کہ اس سلسلے میں گمراہ اور فاسق لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا امام رازی اور امام جرجانی کا بھی یہی خیال ہے۔

البتہ امام سرخسی اور متکلمین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ ان لوگوں کا اعتبار کیا جائے گا میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ اگر وہ فاسق اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہے اور اس نے کسی ایسی بدعت کا ارتکاب کیا ہے جس کی بنیاد پر اس کی تکفیر کی جا چکی ہے تو اس کے اختلاف کا اعتبار نہیں ہوگا لیکن اگر اس کی تکفیر نہیں ہوئی ہے تو اس صورت میں اس کا اعتبار ہوگا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امام اسفرائینی کا بھی یہی خیال تھا۔ [1]

غیر صحابہ کا اجماع اور اس کا حکم

ایک پانچواں سوال یہ پیدا ہوگیا ہے کہ اجماع صحابہؓ کی خصوصیات میں سے ہے یا بعد کے علماء بھی اجماع کر سکتے ہیں اور اگر بعد کے ادوار میں کسی بات پر اجماع ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ ایک گروہ کا خیال ہے کہ ہر دور کے لوگوں کا اجماع حجت ہوگا۔

امام داؤد اور اہل ظاہر کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ غیر صحابہ کے اجماع کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا ایک روایت کے لحاظ سے امام احمد کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ [2]

اجماع صحابہ کا حکم تابعی کے اختلاف کی صورت میں

ایک چھٹا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کی کسی مجلس میں کوئی تابعی عالم موجود رہے ہوں اور انھوں نے صحابہ کرام کی کسی متفقہ رائے سے اختلاف کیا ہو تو صحابہ کرام کا وہ اجماع معتبر ہوگا یا نہیں؟

اس سلسلے میں عام فقہاء اور متکلمین کی رائے یہ ہے کہ وہ اجماع معتبر نہیں ہوگا۔

---

[1] التمہید: ۳/۲۵۲-۲۵۳۔ [2] التمہید ۳/۲۵۶

امام ابوالخطاب حنبلی کہتے ہیں کہ ہمارے شیخ اور بعض شوافع کا یہ خیال ہے کہ وہ اجماع معتبر ہوگا اور اس تابعی عالم کے اختلاف کو کوئی اہمیت نہیں دی جائے گی۔ ایک روایت کے لحاظ سے امام احمد کی بھی یہی رائے ہے اور خلال نے بھی اسی کو ترجیح دیا ہے۔ [1]

اجماع اہل مدینہ کی حیثیت

ایک ساتواں سوال یہ ہے کہ اہل مدینہ اگر کسی بات پر اجماع کر لیں تو اس کی کیا حیثیت ہوگی؟ عام لوگوں کا کہنا ہے کہ تنہا اہل مدینہ کا اجماع حجت نہیں ہوگا۔

امام مالک کا خیال ہے کہ تنہا اہل مدینہ کا بھی کسی بات پر اجماع کر لینا دوسروں کیلئے حجت ہوگا۔ [2]

اجماع تابعین کی حیثیت

ایک آٹھواں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں صحابہ کے دو اقوال ہوں پھر بعد میں تابعین کسی ایک ہی قول پر اجماع کر لیں تو اس دوسرے قول کی اختیار کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

امام اشعری، اور کچھ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ کے اصحاب کا کہنا ہے کہ ایسی صورت میں اس دوسرے قول کو اختیار کرنا ناجائز ہوگا۔ اسی طرح کا اختلاف شوافع کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ [3]

وہ اجماع جس کی بنیاد اجتہاد پر ہو

اس سلسلے میں ایک اور سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا قیاس و اجتہاد کی بنیاد پر اجماع ہو سکتا ہے نیز اگر اس انداز سے اجماع ہو جائے تو کیا اس کی مخالفت جائز ہوگی؟

امام ابن جریرؒ اور اہل ظاہر کا کہنا ہے کہ اس طرح کا اجماع ناقابل اعتبار ہوگا۔ امام ابن جریر کی دلیل یہ ہے کہ وہ اجماع جس سے علم قطعی کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اسکی بنیاد خبر واحد یا قیاس پر نہیں رکھی جا سکتی کیونکہ خود خبر واحد اور قیاس سے علم قطعی کا فائدہ نہیں حاصل ہوتا تو جس چیز کی بناء ان دونوں پر ہو اس [سے علم قطعی کا فائدہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے]

اس کے برعکس کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ اگر اجتہاد کی بنیاد پر کبھی اجماع ہو جائے تو اس کی مخالفت جائز نہیں ہوگی۔ [4]

باقی آئندہ

---

[1] التمہید ۳/۲۶۷-۲۶۸۔ [2] التمہید ۳/۲۷۳-۲۷۴۔ [3] التمہید ۳/۲۹۷/۲۹۸، [4] التمہید ۳/۲۹۳-۲۸۸۔

محمد قمرالدین قمرؔ رام نگری

نعتِ سرورِ کائناتؐ

ہے چھائی عالم پہ جس کی رحمت　　وہ زینتِ محفلِ رسالت
وہ ایک آدرش جس کی سیرت　　نہ پوچھ میرے نبیؐ کی عظمت
جو سارے نبیوں کا تاجور ہے　　جو کل جہاں سے عظیم تر ہے
کمالِ خلقت ہے جس کی بعثت
نہ پوچھ میرے نبی کی عظمت

جو رب کا سچا پیام لایا　　جو زندگی کا نظام لایا
جو آج بھی شمعِ ہدیٰ ہے　　وہ ایک زندہ کلام لایا
وہ سب سے اعلیٰ وہ سب سے برتر　　نہ جس کا ثانی نہ جس کا ہمسر
وہ فخرِ دیں فخرِ آدمیت
نہ پوچھ میرے نبی کی عظمت

جو آیا فصلِ بہار بن کر　　سکون و صبر و قرار بن کر
دلوں میں جس نے جگہ بنائی　　سدا پریم اور پیار بن کر
وہ سب کی ڈھارس بندھانے والا　　ہر ایک کے کام آنے والا
کرم سراپا، سراپا شفقت
نہ پوچھ میرے نبی کی عظمت

وہ جس سے روشن فلک زمیں ہے　　جو حسن کیا پیکرِ حسیں ہے
وہ دور جس سے ہوئے اندھیرے　　جو نور کیا نورِ آفریں ہے
ضیائے جس کی ہیں ماند سارے　　ہوں ماہ و خورشید یا ستارے
وہ شاہکارِ جمالِ فطرت
نہ پوچھ میرے نبی کی عظمت

وہ خود ہی رہبر بھی کارواں بھی　　وہ خود ہی نقشہ اور خود بیاں بھی
وہ جس کی خوشبو سے مہکا عالم　　وہ خود ہی گل اور گلستاں بھی
جو غنچہ بھی ہے شمیم بھی ہے　　بہار بھی ہے نسیم بھی ہے
وہ حاصلِ رنگ و نور و نکہت
نہ پوچھ میرے نبی کی عظمت

وہ تذکرہ جس کا کو بہ کو ہے　　جو زہد و تقویٰ کی آبرو ہے
وہ علم و صبر و رضا کا پیکر　　وہ عدل و انصاف جس کی خو ہے
جو سجدے سجدے میں شب گزارے　　جو دکھ میں یارب تجھی کو پکارے
ہے جس کی کل زندگی عبادت
نہ پوچھ میرے نبی کی عظمت

جو خود ہی جادہ ہے خود ہی منزل　　جو خود ہی طوفاں ہے خود ہی ساحل
صفات ہیں بے مثال جس کی　　حیات جس کی حیات کامل
جو شاہ بھی ہے فقیر بھی ہے　　غنی ہے جو بے نظیر بھی ہے
ہے جس کی جود و سخا کی شہرت
نہ پوچھ میرے نبی کی عظمت

شفیق ایسا کریم ایسا　　رؤف ایسا رحیم ایسا
جو کھا کے پتھر بھی دے دعائیں　　وہ ایسا صابر حلیم ایسا
چلائیں ان پہ جو تیغ و خنجر　　جو ان کو کر دیں وطن سے باہر
وہ ان کے حق میں بھی ظلِ رحمت
نہ پوچھ میرے نبی کی رحمت

دورِ جدید کے مسائل اور اُن کا حل

ترجمہ از: محمد اسمٰعیل فلاحی

سعودی عرب کے جلیل القدر علماء کا ایک فعال بورڈ ہے جس کے صدر مشہور محدث و فقیہ و بزرگ عالم دین شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز ہیں۔ اس بورڈ کے بعض فتووں کا ترجمہ ہم نذرِ قارئین کر رہے ہیں۔ ان فتووں کے آخر میں شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز، عبداللہ بن قعود، عبداللہ بن غدیان اور عبدالرزاق عفیفی کے دستخط ہیں۔

فتویٰ نمبر ۱۶۷۸ ۔ تاریخ ۱۳/۱۰/۱۳۹۷ھ

س: عورت کے لئے اونچی ایڑی کا جوتا پہننا اور ناخن پالش کا استعمال کرنا کیسا ہے؟ اور کیا بہتر ہے ناخن پالش یا رنگ سے رنگنا؟ نیز یہ بھی بتائیے کہ دورانِ حیض مہندی لگانے کا کیا حکم ہے؟

ج: (۱) اونچی ایڑی کا جوتا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے عورت کے گرنے کا خطرہ رہتا ہے اور انسان کو ازروئے شرع خطرات سے بچنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ (سورہ البقرۃ ۱۹۵) "اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو" ولا تقتلوا انفسکم (سورہ نساء ۲۹) "اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو"

نیز اس سے عورت کا قد اور اس کا سرین اصل حیثیت سے زیادہ ظاہر ہوتا ہے اور یہ ایک طرح کا فریب دینا ہے۔ پھر اس سے جسم کی بعض زینت کی نمائش ہوتی ہے جس سے مومن خواتین کو روکا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن او آبائھن او آباء بعولتھن او ابنائھن او ابناء بعولتھن او اخوانھن او بنی اخوانھن او بنی اخواتھن او نسائھن۔ (سورہ النور ۳۱) "وہ اپنا بناؤ سنگھار ظاہر کریں

علاوہ ان لوگوں کے سامنے، شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے، اپنے میل جول کی عورتیں۔"

(ب) رہا ناخن پالش تو وہ اس لئے جائز نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے وضو کا پانی ناخنوں تک نہیں پہنچتا ہے۔

(ج) دورانِ حیض مہندی کے استعمال کے سلسلہ میں ہمارے علم کی حد تک کوئی ممانعت نہیں ہے بالکل ویسے ہی جیسے پاکی کی حالت میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔

فتویٰ نمبر ۱۳۹۳ ۔ تاریخ ۲۵/۹/۱۳۹۶ھ

س: کیا عام حالات میں بغیر کسی مجبوری کے عورت کا کسی جانور کو ذبح کرنا جائز ہے؟

ج: عورت کا ذبح کرنا جائز ہے بشرطیکہ وہ مسلمان ہو یا اہلِ کتاب میں سے ہو کیونکہ ذبح کے معاملے میں جو شرعی دلائل ہیں وہ عام ہیں اور کوئی ایسی تخصیص نہیں ہے جو عورت کو اس سے خارج کرتی ہو، اور کعب بن مالک والی حدیث سے بھی یہی پتہ چلتا ہے۔ وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے پاس بہت سی بکریاں تھیں جو (مدینہ منورہ میں واقع) سلع نامی پہاڑی پر چرتی تھیں۔ ہماری ایک باندی نے ایک بکری کو مرنے کے قریب دیکھا اس نے ایک پتھر توڑا اور اس سے اس کو ذبح کر ڈالا۔ میرے والد نے لوگوں سے کہا کہ نہ کھانا جب تک میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کروں یا کسی کو آپ کے پاس بھیجوں جو آپ سے اس بارے میں دریافت کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے اس کے کھانے کا حکم دے دیا۔ (اس روایت کی تخریج امام بخاری نے کی ہے)۔

عورت کے ذبح کرنے کے باوجود نبی نے اس کو کھانے کی اجازت دے دی۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ عورت کا ذبح کرنا جائز ہے۔ اگر اس کا ذبح کرنا جائز نہ ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کی وضاحت فرما دیتے۔ اس لئے کہ علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ بوقت ضرورت کسی معاملہ میں مذکورہ وضاحت نہ کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جائز نہیں ہے۔

س: غیر ممالک سے درآمد شدہ مذبوح اور ذبح بستہ مرغیوں کو کھانے کے سلسلہ میں کیا حکم ہے؟

ج :- وہ گوشت جو بیرون ملک سے ذبح ہو کر ہمارے یہاں آتا اور بازاروں میں بکتا ہے اس کے بارے میں ہمارے بورڈ میں ایک سوال آیا تھا کہ آیا اس کو کھانا جائز ہے یا نہیں؟ جو جواب ہم نے دیا تھا اسی کو دہرا دینا کافی سمجھتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ اگر جانوروں یا پرندوں کو ذبح کرنے والا اہل کتاب نہیں ہے جیسے کہ روس، بلغاریہ کے ملحد اور بے دین یا اس جیسے دوسرے ممالک کے کفار، تو ان کا ذبیحہ کھانا ممنوع ہے خواہ اس کو اللہ کے نام سے ذبح کیا ہو یا غیر اللہ کے نام سے۔ کیونکہ اصلاً صرف مسلمانوں ہی کے ذبیحے حلال ہیں۔ ہاں غیر مسلموں میں سے اہل کتاب کے ذبیحے نص شرعی کی رو سے اس سے مستثنیٰ ہیں اور اگر اس کو ذبح کرنے والا اہل کتاب یہود و نصاریٰ میں سے کوئی ہو تو اگر اس نے اس کو اس کی گردن پر چھری پھیر کر ذبح کیا ہے یا اس کو نحر کیا ہے (نحر سے مراد جانور کو کھڑا کر کے یا بٹھا کر اس کے نرخرہ میں چھری یا کوئی دھاردار یا نوکیلی چیز پیوست کر دی جائے، ایسا عام طور سے اونٹ کے ساتھ کرتے ہیں) اور اس پر اللہ کا نام بھی لیا تو بالاتفاق اس کا کھانا درست ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم (المائدہ ۵) یعنی اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور اگر اس نے قصداً اس پر اللہ کا نام نہیں لیا اور نہ ہی کسی دوسرے کا نام لیا تو ایسے ذبیحے کے کھانے کے سلسلے میں اختلاف ہے لیکن اگر ہمیں معلوم نہیں ہے کہ اہل کتاب نے اپنے ذبیحے پر اللہ کا نام لیا ہے یا نہیں تو ارشاد ربانی وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم کے عموم کی بناء پر وہ حلال ہے اور اگر اس نے اس پر غیر اللہ کا نام لیا ہے تو اسے کھانا جائز نہیں، اس کی حیثیت مردار کی سی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ وانہ لفسق۔ یعنی تم اس میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا ہے اور اس کا کھانا فسق ہے۔

اور اگر کسی نے جانور کے سر پر پستول سے مار دیا یا اس پر بجلی کا کرنٹ دوڑا دیا اور وہ مر گیا تو وہ موقوذۃ (کسی چوٹ سے مرا ہوا) کے حکم میں ہوگا اگرچہ اس کے بعد اس کی گردن کاٹ دی ہو۔ اللہ نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل لغیر اللہ بہ والمنخنقۃ والموقوذۃ

(المائدہ ۳) یعنی تم پر حرام کیا گیا مردار، خون، سور کا گوشت، وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اور وہ جو گلا گھٹ کر یا چوٹ کھا کر مرا ہو۔

البتہ اس کے سر پر سامنے سے مارنے کے بعد اگر وہ زندہ تھا اور اسے ذبح کر دیا گیا تو اسے کھایا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی بناء پر جو مذکورہ بالا آیت کے آخر میں ہے (........ والموقوذۃ والمتردیۃ والنطیحۃ وما اکل السبع الا ما ذکیتم) تم پر حرام کیا گیا ...... جو چوٹ کھا کر یا بلندی سے گر کر یا سینگ کھا کر مرا ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا۔

پس اللہ سبحانہ نے حرام کردہ جانوروں میں سے ان کو مستثنیٰ کر لیا ہے جن کو زندہ پانے کی صورت میں ذبح کر دیا جائے۔ مردہ ہو جانے کی صورت میں ذبح کرنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

جو جانور گلا گھونٹنے سے یا بجلی کا کرنٹ دوڑانے سے مر جائے تو بالاتفاق نہیں کھایا جائے گا اگرچہ اس پر گلا گھونٹتے وقت یا کرنٹ لگاتے وقت یا کھاتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

• رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ "سموا اللہ وکلوا" اللہ کا نام لو اور کھا لو۔ دراصل یہ ان ذبیحوں کے بارے میں ہے جن کو ان لوگوں نے ذبح کیا تھا جو جاہلیت سے نکل کر اسلام کے دائرے میں نئے نئے داخل ہوئے تھے اور جنہیں معلوم تھا کہ ان پر اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں۔ چنانچہ آپ نے ان مسلمانوں کو جنہیں شک تھا کہ ان لوگوں نے اس پر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا ہے یا نہیں حکم دیا کہ وہ بنا فرض ادا کریں یعنی اللہ کا نام لے کر کھائیں اور ان ذبح کرنے والوں کے معاملہ کو مسلمانوں کے اپنے عند الذبح اللہ کا نام لینے کے عمل پر محمول کر لیا۔

••

"قصائدِ جاہلی اور مسئلۂ تعلیق"

مسیح الزماں فلاحی

شعر کی حقیقت اور عربوں کے نزدیک شاعری کا مقام

شاعری۔ جذبات کی ترجمانی کا نام ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ رنج وغم، خوشی ومسرت، طرب وسرمستی، غیظ وغضب اور فخر ومباہات سے پیدا ہونے والے احساسات کی الفاظ کے ذریعے عکاسی کر دیتا ہے۔ سامع پر شعر جو اثر ڈالتا ہے وہ نثر سے پیدا نہیں ہوتا۔ ایک شعر ایک لمبی عبارت کا کام دے سکتا ہے۔ دنیا کی ہر قوم اور ہر زبان میں شعر کی یکساں اہمیت ہے لیکن عربوں کا شاعری سے جو گہرا رشتہ ہے، اور ان کے ہاں اس کی جو قدر وقیمت ہے وہ دوسروں سے ہزار گنا زیادہ ہے۔ شاعری کو عربوں کا دیوان کہا جاتا ہے جس میں ان کی معاشرتی وتمدنی زندگی، ان کے افکار وخیالات، اور ان کی جنگوں اور کارناموں کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ شاید یہ بات مبالغہ آرائی نہ ہوگی کہ اگر شعر وشاعری کا وجود نہ ہوتا تو عربوں کی زندگی کے بیشتر حالات اور ان کے تمدن ومعاشرت کے گوناگوں پہلو نظروں سے اوجھل رہ جاتے۔ آج انھیں اپنی جن اعلیٰ صفات وخصوصیات اور جن بلند حوصلوں اور کارناموں پر ناز ہے اور جن پر وہ فخر سے اپنا سر اونچا کرتے ہیں وہ شاعری ہی کے محفوظ کردہ سرمایہ کا رہینِ منت ہے۔ مزید برآں شاعری عربوں کی قدرت بیانیہ اور تعبیرات واسالیب میں ان کے تفوق وبرتری کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ان کی شاعری کا بہت کم حصہ راویوں کے ذریعے ہم تک پہنچ سکا ہے ورنہ اس کا بیشتر حصہ گردشِ زمانہ کی دست برد کی نذر ہو چکا ہے۔

شعر کی تدوین

جاہلی دور میں عربوں کی شاعری مدون شکل میں محفوظ نہ تھی اور نہ ہی تحریر وکتابت کا زیادہ رواج تھا۔ ان کا زیادہ اعتماد اپنی قوتِ حافظہ پر تھا۔ پھر جب اسلام ان پر سایہ فگن ہوا، فتوحات کا سیلاب امڈ پڑا، اور مختلف شہر وعلاقے بسائے جانے لگے

اور جمع وتدوین کا سلسلہ شروع ہوا تو غزوات نبوی اور احادیث وغیرہ کی کتابت وتدوین کے ساتھ ساتھ مختلف قبائل کے احوال وکوائف اور ان کے اشعار کے جمع وتدوین کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ اصول ومناہج کی بنیاد پر باقاعدہ تدوین شعر کا آغاز دوسری صدی سے ہوا جس کے رواۃ وجامعین میں سرِ فہرست مفضل ضبی اور اصمعی وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے دو مجموعے مفضلیات اور اصمعیات منظرِ عام پر آئے جو تاریخ ادب عربی میں ماخذ وبنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے قبل شعر کا کوئی مجموعہ نہیں ملتا سوائے اس روایت کے کہ عربوں نے زمانۂ جاہلیت کے سات طویل قصائد منتخب کیے تھے جو معلقات کے نام سے مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حماد راویہ وہ پہلا شخص ہے جس نے باقاعدہ ایک دیوان کی شکل میں انھیں جمع کیا تھا۔

معلقات کی ادبی وفنی حیثیت

یہ بات اہل علم وادب کے ہاں متفق علیہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے مشہور ساتوں قصائد جو معلقات کے نام سے جانے جاتے ہیں عربی ادب کا شاہکار اور فصاحت وبلاغت کے بلند معیار کا نمونہ ہیں۔ یہ قصائد عربوں کی فکری بلندی، تعبیر واسلوب کی پختگی اور زبان وبیان کے عہدِ کمال کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ قصائد جس ادبی حسن وجمال، نزاکت ولطافت اور باریکی ودقت سے متصف ہیں وہ دوسرے جاہلی اشعار میں نہیں پائی جاتی۔ مزید برآں یہ قصائد شاندار تشبیہات، لطیف کنایات اور بلیغ استعارات کا مرقع ہیں۔ ان کے مطالعہ سے عرب کی معاشرتی وتمدنی زندگی، غیر عربوں سے ان کے تعلقات واستفادہ کی مقدار، خانگی چپقلش اور قبائلی جنگوں پر بھی روشنی پڑتی ہے، جانوروں کے ساتھ ان کی دلچسپی وتعلق کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ان قصائد کی تعداد

قریب قریب تمام اہل ادب اس بات پر متفق ہیں کہ ان قصائد کی کل تعداد سات ہے اور ان کے شعراء حسب ذیل ہیں:

امرؤ القیس بن حجر کندی، زہیر بن ابی سُلمیٰ، طرفۃ بن العبد، عمرو بن کلثوم، لبید بن ربیعہ، حارث بن حلزۃ اور عنترۃ بن شداد۔

البتہ ابو زید قرشی جو "جمہرۃ اشعار العرب" کے جامع ومؤلف ہیں انھوں نے اس باب میں

اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک حارث اور عنترہ اس مجموعے سے خارج ہیں اور ان کی جگہ انھوں نے نابغہ ذبیانی اور اعشیٰ کو رکھا ہے۔

تبریزی جو معلقات کے شارح ہیں، انھوں نے ان سارے شعراء کو جمع کر دیا ہے اور مزید ایک اور جاہلی شاعر عبید بن الابرص کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ اس طرح ان کے نزدیک شعرائے معلقات کی تعداد دس ہے۔ امرؤ القیسؔ، زہیرؔ، طرفہؔ، عمرو بن کلثومؔ، لبیدؔ، حارثؔ، عنترہؔ، نابغہؔ، اعشیٰؔ اور عبیدؔ بن الابرص۔

وجہ تسمیہ

ان قصائد کے وجہ تسمیہ کے بارے میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ عام طور سے یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ ان قصائد کو معلقات اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ عربوں نے ان قصائد کی رفع شان کے لئے انھیں خانہ کعبہ کے پردے پر آویزاں کیا تھا۔ گرچہ یہ روایت بہت زیادہ مشہور ہو گئی ہے، اور بعض قدیم و جدید اہل علم و ادب نے اس روایت کو تسلیم بھی کر لیا ہے تاہم بعد میں اس پر سخت اعتراضات کئے گئے ہیں اور اس روایت کو موضوع قرار دیا گیا ہے۔

قدیم ادباء میں جن لوگوں نے اس روایت کی صحت کو تسلیم کیا ہے ان میں سر فہرست ابن عبد ربہ کا نام شامل ہے جنھوں نے ان قصائد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "عربوں کی شعر و شاعری سے شیفتگی و محبت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ انھوں نے اپنی قدیم شاعری سے سات قصائد چن لئے اور انھیں کتان کے تہہ کردہ کپڑے میں آب زر سے لکھ کر خانہ کعبہ کے پردوں سے آویزاں کر دیا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مذهبة امرئ القيس و مذهبة زهير (یعنی وہ قصیدہ جو آب زر سے لکھا گیا تھا) مذہبات کی تعداد کل سات ہے اور کبھی انھیں معلقات بھی کہا جاتا ہے۔" [1]

بغدادی "خزانۃ الادب" میں فرماتے ہیں کہ "معلقہ کا مطلب یہ ہے کہ عہد جاہلی میں کوئی شاعر کسی دور دراز خطے میں کوئی شعر کہتا تو اسے درخور اعتنا نہ سمجھا جاتا جب تک کہ وہ حج کے زمانہ میں مکہ آ کر قریش کی محفلوں میں اسے پیش نہ کرے۔ اگر وہ اسے پسند کرتے تو وہ روایت کرتا اور یہ بات اس کے لئے باعث افتخار ہوتی، پھر اسے وہ کعبہ کے کسی ستون پر آویزاں کر دیتا تاکہ

۱؎ العقد الفرید، ج ۳

اس پر لوگوں کی نظریں پڑیں۔ دوسری صورت میں جبکہ قریش اسے رد کر دیتے تھے وہ نظر انداز کر دیا جاتا اور کوئی اس کو اہمیت نہ دیتا۔ سب سے پہلے جس شاعر نے کعبہ میں اپنے اشعار آویزاں کئے تھے وہ امرؤ القیس ہے پھر اس کے بعد متعدد شعراء نے اپنے قصائد آویزاں کئے تھے جن کی تعداد سات ہے۔ دوسرا طرفہ ہے، تیسرا زہیر، چوتھا لبید، پانچواں عنترہ، چھٹا حارث اور ساتواں عمرو بن کلثوم ہے۔ اور یہی بات مشہور ہے۔" [1]

ابن رشیق قیروانی نے بھی "عمدہ" میں اصحاب معلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "معلقات کو مذہبات اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ جاہلی دور کی شاعری سے منتخب کردہ ہیں جنھیں آب زر سے تحریر کیا گیا تھا اور کعبہ میں آویزاں کیا گیا تھا۔" [2]

علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ "شعر عربوں کا دیوان ہے جس میں ان کے علوم، اخبار، حالات و افکار اور ان کی حکمت کی باتیں محفوظ ہیں۔ ممتاز سرداران عرب اس باب میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی برابر کوشش کرتے رہتے، بازار عکاظ میں جمع ہو کر اشعار پڑھتے اور چوٹی کے اصحاب بصیرت شعراء کے سامنے پیش کرتے، رفتہ رفتہ وہ اپنے اشعار بیت اللہ الحرام کے ستونوں پر، جو ان کا جائے حج و بیت ابراہیم تھا، آویزاں کرنے میں بھی مقابلہ کرنے لگے جیسا کہ امرؤ القیس، نابغہ، زہیر بن ابی سلمیٰ، عنترہ بن شداد، طرفہ بن العبد، علقمہ بن عبدۃ اور اعشیٰ وغیرہ نے کیا تھا۔ وہی شاعر اپنے اشعار خانہ کعبہ میں آویزاں کرنے میں کامیاب ہوتا جسے قوم و قبیلہ کی حمایت، خاندانی عصبیت اور قبیلۂ مضر میں اونچا مقام حاصل ہوتا۔ یہی بات ان قصائد کے وجہ تسمیہ کے بارے میں کہی گئی ہے۔" [3]

عربی ادب کے جدید مؤرخین میں جرجی زیدان نے بھی تعلیق کی روایت تسلیم کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "عربوں کے دلوں میں شعر کی جو تاثیر اور عظمت بیٹھی ہوئی تھی اس کے لحاظ سے یہ بات قطعاً مستبعد نہیں ہے کہ ان قصائد کی تعظیم شان کے لئے انھیں خانہ کعبہ میں لٹکایا گیا ہو۔" [4]

۱؎ خزانۃ الادب للبغدادی۔ ۲؎ العمدۃ لابن رشیق ج ۱۔ ۳؎ تاریخ ابن خلدون ج ۱
۴؎ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ج ۱، ص ۹۶

قدیم ناقدین میں سب سے پہلے صریح لفظوں میں ابن الکلبی (م ۲۰۴) نے تعلیق کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بعد میں جن لوگوں نے اس رائے کو غلط قرار دیا ان میں سب سے پہلا نام معلقات کے شارح ابو جعفر نحاس (م ۳۳۷ھ) کا آتا ہے جنھوں نے کھل کر تعلیق کی روایت کا انکار کیا۔ عصر حاضر میں ادباء و ارباب قلم کی اکثریت اس بات پر متفق نظر آتی ہے کہ تعلیق کی روایت سراسر موضوع اور گھڑی ہوئی ہے۔ مصطفےٰ صادق رافعی نے اپنی کتاب "تاریخ آداب العرب" میں اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے اور اس روایت کے تسلیم کرنے میں جو اشکالات پیش آتے ہیں ان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر احمد محمد حوفی، شوقی ضیف اور احمد امین نے بھی اس روایت کو غلط قرار دیا ہے۔ ذیل میں مخالفین کے دلائل کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ اگر یہ روایت درست ہوتی تو قدیم نصوص میں ضرور اس کا تذکرہ ملتا جس سے اس کی تائید ہوتی لیکن قرآن، حدیث یا مکہ کی تاریخ وغیرہ میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ملتا۔ [1]

۲۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم خود بھی اپنے بعض صحابہ سے اشعار پڑھواتے، سنتے اور اس پر اپنی رائے کا اظہار فرماتے، خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرتے لیکن کہیں بھی آپ کی زبان سے جاہلی قصائد کے خانۂ کعبہ میں آویزاں کئے جانے کا تذکرہ نہیں ملتا۔ اسی طرح صحابہ کرامؓ جن میں سے بہت سے شاعر بھی تھے ان کے اقوال میں بھی اس جانب کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ [2]

۳۔ خانۂ کعبہ کی دیواریں متعدد بار منہدم کی گئیں اور ان کی از سر نو تعمیر ہوئی، اگر یہ قصائد دیوار کعبہ پر آویزاں ہوتے تو تعمیر کعبہ کی تاریخ میں ضرور اس کا ذکر آتا۔

۴۔ قدیم عربی ادباء جن کی تصنیفات مصادر ادب کی حیثیت رکھتی ہیں مثال کے طور پر ابن سلام جمحی (م ۲۳۲ھ) ابو عثمان جاحظ (م ۲۵۵ھ) ابن قتیبہ (م ۲۷۶ھ) مبرد (م ۲۸۵ھ) ابو الفرج اصفہانی (م ۳۵۶ھ) باقلانی (م ۴۰۳ھ) وغیرہ۔ ان میں سے کسی نے بھی اپنی کتابوں میں

[1] الحیاۃ العربیۃ من الشعر الجاہلی ص ۲۱۱

[2] تاریخ آداب العرب: مصطفیٰ صادق رافعی ج ۳، ص ۱۹۲

تعلیق کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی ان قصائد کا معلقات کے نام سے تذکرہ کیا ہے حالانکہ انھوں نے اپنی کتابوں میں ان قصائد کے بیشتر اشعار نقل کئے ہیں اور ان کے شعراء کے حالات بھی قلمبند کئے ہیں۔ [1]

۵۔ عرب فخر و مباہات اور اپنے قبیلے کے اوصاف بیان کرنے میں مشہور ہیں۔ اگر یہ قصائد فی الواقع خانۂ کعبہ میں آویزاں کئے گئے ہوتے تو ان سے نسبت رکھنے والے بعد کے شعراء ضرور فخر سے اسے بیان کرتے اور اپنے متعلق شاعر کی مدح سرائی اور اس کے قبیلے کی تعریف میں یقیناً رطب اللسان ہوتے لیکن کسی بھی جاہلی یا اسلامی شاعر نے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ [2] فرزدق نے اپنے ایک قصیدہ میں اپنے متعدد قدیم شعراء کا نام لے کر فخر سے اپنے قبیلے کا سر اونچا کیا ہے لیکن اس کے کسی قول سے بھی جاہلی قصائد کی تعلیق کا اشارہ نہیں ملتا۔

۶۔ ان قوی ثبوت کے علاوہ متعدد دوسرے نام بھی ہیں جو اس بات کی دلیل ہیں کہ معلقات کا نام ابتدا ہی سے متفق علیہ نہیں رہا ہے کیونکہ اگر یہ روایت درست ہوتی تو یہ نام بھی سب کے ہاں مسلم ہوتا۔ اس کے بجائے تیسری صدی ہجری کے آخر عہد تک کتب ادب میں ان قصائد کے جو نام ملتے ہیں وہ یہ ہیں:

الطوال، السبع الطوال، الجاہلیات، السبعیات، السموط، مذہبات، القصائد المشہورۃ، السمیرۃ۔

حماد راویہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے سب سے پہلے ان قصائد کو ایک مجموعہ کی شکل میں پیش کیا تھا اور وہ دوسری صدی کا راوی ہے۔ اس نے خود بھی ان قصائد کو معلقات کے نام سے پیش نہیں کیا تھا بلکہ ان قصائد کو مشہورات یا السبع الطوال کا نام دیا تھا۔ یہ نام دراصل حدیث شریف کے الفاظ سے اخذ کیا گیا ہے [illegible] السبع الطوال وھی البقرۃ

[1] ایضاً ص ۱۸۸ (یہاں یہ بات واضح رہے کہ زوزنی کی متداول شرح کے سرورق پر جو المعلقات السبع چھپا ہوا ہے وہ ناشرین کی طرف سے ہے)

[2] الحیاۃ العربیۃ من الشعر الجاہلی۔ ص ۲۱۲

وآل عمران والنساء والمائدة والانعام والاعراف۔ ساتویں سورہ کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ سورۂ یونس ہے، سورۂ یوسف ہے یا سورۂ کہف۔

"جمہرۃ اشعار العرب" کے مؤلف وجامع ابوزید قرشی نے ان قصائد کو سموط کے نام سے درج کیا ہے۔ سموط، سمط کی جمع ہے جس کے معنی ہار کے آتے ہیں۔

مصطفی صادق رافعی فرماتے ہیں کہ "سموط" نام بھی درحقیقت حماد راویہ کا منقول ہے کیونکہ کے حالات زندگی میں اس روایت کا تذکرہ ملتا ہے کہ عرب اپنے اشعار قریش کے سامنے پیش کرتے تھے ان میں سے جو اشعار وہ قبول کر لیتے وہ مقبول و عام ہو جاتے اور جو اشعار رد کر دیتے وہ رد کر دیئے جاتے۔ ایک بار علقمہ بن عبدہ ان کے پاس حاضر ہوا اور اس نے یہ شعر سنایا ؎ ھل ما علمت وما استودعت مکتوم۔

قریش نے اسکی تحسین کی اور کہا: ھذہ سمط الدھر، دوسرے سال وہ پھر حاضر ہوا اور یہ شعر پیش کیا ؎ طحا بک قلب فی الحسان طروب۔ انھوں نے کہا: ھاتان سمطا الدھر۔ [1]

باقلانی نے اپنی مشہور تصنیف "اعجاز القرآن" میں جہاں ان قصائد کا تذکرہ کیا ہے انھیں السبعیات کے نام سے موسوم کیا ہے۔ [2]

۷۔ دوسری صدی سے پانچویں صدی تک ان قصائد کے متعدد شارحین نظر آتے ہیں جن میں سرفہرست ابوجعفر نحاس (م ۳۳۸ھ)، ابوعلی القالی (م ۳۵۶ھ)، ابوبکر بطلیوسی (م ۴۹۴ھ)، ابوزکریا تبریزی (م ۵۰۲ھ) اور زوزنی (م ۴۸۶ھ) وغیرہ شامل ہیں لیکن حیرت ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی ان قصائد کو معلقات کے نام سے موسوم نہیں کیا ہے۔

مصطفی صادق رافعی نے تعلیق کے انکار کی مختلف دلیلیں پیش کرنے کے بعد اس احتمال کا اظہار کیا ہے کہ بعید نہیں کہ ابن الکلبی نے جو حماد کے راویہ شاگرد ہے جب یہ دیکھا ہو کہ دورِ جاہلی کے اشعار سے لوگوں کی توجہات پھر گئی ہیں اور ان کا اس سے تعلق صرف شواہد و حجت کے طور پر رہ گیا ہے تو اس نے یہ خبر گھڑلی ہو تاکہ ان قصائد کی قدر و قیمت دوبارہ پہلے کی طرح لوگوں کو

---

[1] تاریخ آداب العرب، ص ۱۹۰
[2] اعجاز القرآن للباقلانی

متوجہ کر سکے۔ دوسری بات کسی بھی تاریخ داں سے پوشیدہ نہیں کہ اس وقت لوگ دورِ جاہلی کے کارناموں کے جاننے کے بڑے دلدادہ تھے کیونکہ ان کی موجودہ حکومت سے عربیت کا رنگ مٹتا جا رہا تھا۔ [1]

اس قیاس کے اظہار کے بعد انھوں نے صریح طور پر اس حقیقت سے بھی نقاب کشائی کی ہے کہ جن لوگوں نے تعلیق کی روایت کی ہے وہ دراصل اس تاریخی واقعے سے ماخوذ ہے کہ مکہ میں جب اسلام پھیلنے لگا اور حضرت حمزہؓ و عمرؓ کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد مسلمان طاقتور ہو گئے تو قریش کے سرداروں نے مل کر یہ طے کیا کہ بنو ہاشم کا سماجی بائیکاٹ کیا جائے۔ ان سے نکاح اور خرید و فروخت کو روا نہ رکھا جائے۔ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کیلئے انھوں نے ایک صحیفہ تحریر کیا اور اسے خانۂ کعبہ کے اندر آویزاں کر دیا۔ [2]

ان وجوہ و اسباب کی بنیاد پر قصائد جاہلی کی تعلیق کا جو قصہ مشہور کیا گیا ہے اسے قبول کرنے میں سخت تامل ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ جن لوگوں نے اس روایت کی صحت کو تسلیم کیا ہے ان کے پاس کوئی واضح اور مضبوط دلیل نہیں ہے۔ انھوں نے محض ایک مشہور روایت کے طور پر اسے اپنی کتابوں میں نقل کر دیا ہے۔ اس کے برعکس مخالفین نے جو اعتراضات اٹھائے ہیں وہ واقعتاً قابلِ غور ہیں لیکن پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ ادب میں یہ قصائد معلقات کے نام سے کیونکر مشہور ہو گئے۔ اس سلسلے میں ایک رائے ظاہر کی گئی ہے جو میرے نزدیک اس قضیے کا حتمی فیصلہ کر دیتی ہے، وہ یہ کہ:

لفظ "معلقہ" دراصل علقٌ سے نکلا ہے جس کے معنی عمدہ و نفیس کے آتے ہیں جیسا کہ ایک حماسی شاعر کا کہنا ہے ؎

ابیت النعوس ان مکان علقٌ ٭ نفیس لا تباع ولا تعار

یہ مشہور جاہلی قصائد چونکہ عربی زبان و ادب کے شاہکار اور فصاحت و بلاغت کے

---

[1] تاریخ آداب العرب، ج ۳، ص ۱۹۲
[2] ایضاً ص ۱۹۳

بلند رتبے سے ہمکنار ہیں اسی وجہ سے معلقات کا نام دیا گیا ہے یعنی وہ قصائد جو جودت و نفاست کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ علامہ شوقی ضیف نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔[1]

ایک خیال یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ گزشتہ زمانہ میں کوئی بادشاہ تھا اس کے سامنے جب کوئی قصیدہ پیش کیا جاتا اور وہ اسے پسند آتا تو وہ اپنے درباریوں سے کہتا کہ "علقوا لنا هذه" (اس قصیدے کو میرے کتب خانہ میں محفوظ کر دو) بادشاہ کے اسی جملے سے ان قصائد کو معلقات کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔

بعض ادباء نے یہ رائے قائم کی ہے کہ ان قصائد کو معلقات اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہر شخص کے ذہن میں محفوظ و ازبر ہوتے تھے اور یہ لفظ در اصل "علوق بالأذہان" سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے ذہن میں کسی چیز کا ٹک جانا اور ازبر ہونا، اس لئے کہ یہ قصائد عربوں کے چھوٹے بڑے رؤسا و متبوعین سب کے ذہنوں میں محفوظ تھے اور وہ انھیں پوری دلچسپی سے پڑھتے تھے۔

کچھ اور لوگوں نے ان قصائد کے "سموط" کہے جانے کی توجیہ کرتے ہوئے تعلیق سے اس کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کی ہے، کیوں کہ "سمط" کے معنی ہار کے آتے ہیں جو گلے میں لٹکایا جاتا ہے۔

ان قصائد کے معلقات کہے جانے کے بارے میں جو رائے بھی ظاہر کی جائے اس کی حیثیت توجیہ و تاویل سے زیادہ نہیں، لیکن جو بات قابل غور ہے وہ خانہ کعبہ میں انھیں آویزاں کئے جانے کی روایت ہے جو بہت زیادہ مشہور ہوگئی ہے حالانکہ یہ سراسر جھوٹی اور غلط روایت ہے۔ جو تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے اور اس پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں وہ بھی بہر حال لائق توجہ ہیں۔ ••

---

[1] تاریخ الادب العربی، شوقی ضیف، ج ۱، ص ۱۷۶

نعیم الدین اصلاحی

"نماز ایک معجزہ"

از ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب، صفحات: ۴۵

قیمت: پانچ روپئے پینتالیس پیسے، طباعت: عمدہ

ملنے کے پتے: (۱) اسٹوڈنٹس اسلامک پبلیکیشنز (۲) مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶
(۳) مکتبہ اسلامی اردو بازار دہلی ۶۔

اس کتابچہ اور اس کے مصنف کا تعارف اس کے ٹائٹل کے آخری صفحے پر اس طرح کرایا گیا ہے:
"ڈاکٹر صاحب کی تقریروں اور تحریروں میں جہاں ایک طرف ندرت، تازگی اور فکری گہرائی ملتی ہے وہیں ایک تجزیاتی اور سائنٹیفک اسلوب سے قارئین کے سامنے نئے گوشے بھی آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی قرآنی آیات سے خاصا استدلال بھی کیا جاتا ہے۔ "نماز ایک معجزہ" ڈاکٹر صاحب کی ان تقاریر پر مشتمل ایک کتابچہ ہے جو موصوف نے متعدد اجتماعات کے موقع پر کی تھیں۔"

یہ تعارف بالکل صحیح اور واقعہ کے مطابق ہے۔ پوری کتاب اسی انداز تحریر کی مرقع ہے موصوف نے مختلف انداز سے "نماز" کو مسائل زندگی سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ زندگی کا کوئی بھی قابل ذکر گوشہ ایسا نہیں جس پر نماز کے اثرات مرتب نہ ہو رہے ہوں۔ یہ مختصر سی کتاب ڈاکٹر صاحب کی فکری گہرائی، وسعت مطالعہ اور باریک بینی کا بہترین نمونہ ہے۔ ہر پڑھے لکھے آدمی کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ہی مفید ہوگا۔

بعض قرآنی آیات اور احادیث کے ترجمے کے سلسلے میں کچھ گزارشات کرنی ہیں اس امید پر کہ ڈاکٹر صاحب موصوف اس طالب علمانہ گزارش پر ضرور توجہ فرمائیں گے۔

(۱) "واذکروہ کما ھداکم" (البقرہ ۹۸) کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے "اور تم اس کو اس طرح یاد کرو جیسے اس نے تم کو ہدایت دی۔" (ص ۲۵) یقیناً بیشتر مترجمین نے یہی ترجمہ کیا ہے

اور اس کی گنجائش بھی ہے۔ البتہ زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ یہاں "کما" کا ترجمہ "جیسے" کی بجائے "کیونکہ" کیا جائے۔ "کما" جس طرح "تشبیہ" کے لئے آتا ہے، اسی طرح "تعلیل" کے لئے بھی آتا ہے۔ "المنجد" میں ہے: "التعلیل: نحو واذکروا اللہ کما ھداکم، ای لانہ ھداکم۔" اس کی روشنی میں بہتر ترجمہ یہ ہوگا "اللہ کو یاد کرو کیونکہ اس نے تمہیں ہدایت دی ہے"۔

(۲) مشہور روایت "ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تراہ فانہ یراک" کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

"اپنے رب کی عبادت اس طرح کر کہ جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے لیکن تو اسے دیکھنے کی طرح عبادت نہیں کر سکتا تو اس تصور کے ساتھ کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔" (ص۱۵)

اس سلسلے میں دو باتیں عرض کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس روایت کو اس کتاب میں دو جگہ درج کیا گیا ہے اور دونوں جگہ "اعبد ربک" کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے حدیث کی کسی بھی معتبر کتاب میں "اعبد ربک" (امر) نہیں بلکہ "ان تعبد اللہ" "ان تخشی اللہ" اور "ان تعمل" کے الفاظ ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے چوک ہو گئی ہے۔ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح کر لی جائے تو بہتر ہے۔

دوسری یہ کہ ڈاکٹر صاحب کے ترجمے کے لحاظ سے حدیث کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ عبادت اور بندگی رب کا دو مقام ہے ایک اعلیٰ اور دوسرا ادنیٰ۔

بندگی رب کا اعلیٰ مقام یہ ہے۔ بندہ بندگی کے وقت خدا کو دیکھ رہا ہو اور اس کا مشاہدہ کر رہا ہو۔ دوسرا یہ کہ اگر اسے بندگی رب کا یہ اعلیٰ اور ارفع مقام حاصل نہ ہو سکے اور "مشاہدہ حق" کی دولت سے محروم ہو تو کم از کم یہ تصور ضرور رکھے کہ اللہ تعالیٰ اسے ضرور دیکھ رہا ہے۔

مذکورہ حدیث کا یہی مفہوم عام طور پر بیان کیا جاتا ہے اور یہی وہ حدیث ہے جس کی غلط اور من مانی تعبیر نے بہت سے صوفیاء کو گمراہ تک کر دیا۔

اس حدیث کا یہ ترجمہ کرنا چاہیے "تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے۔" "فان لم تکن" میں "ف" "لیکن" کا نہیں "کیونکہ" کا معنی دے رہا ہے۔ یہاں "ف" "تعلیل" کے لئے ہے جس طرح

"کما ھداکم" میں "ک"۔ اور یہ عربی زبان میں نہایت ہی معروف ہے۔ اس حدیث کے ترجمہ میں چند بزرگوں کے علاوہ عموماً لوگوں نے غلطی کی ہے۔

مولانا جلیل احسن صاحب مرحوم نے اس کا ترجمہ اس طرح فرمایا ہے:

"تم اللہ سے اس طرح ڈرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اس لئے کہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔" (زاد راہ ص۲۹)

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح ترجمہ فرماتے ہیں:

"تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے۔" (سیرۃ النبی۔ جلد پنجم۔ طبع پنجم مطبع معارف پریس اعظم گڑھ)

پھر اس حدیث کا مفہوم اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"اب ہم خواہ بادشاہ کو دیکھ رہے ہیں یا وہ ہم کو دیکھ رہا ہے دونوں کا حاصل ایک ہے کہ اپنی نماز کو پورے خضوع، ادب اور تپاک کے ساتھ ادا کریں۔" (تذکرہ ص۲۱)

بحوالہ سلوک سلیمانی باب شاہ راہ معرفت جلد دوم ص۲۰۹ مرتبہ پروفیسر محمد اشرف خاں صاحب سلیمانی صدر شعبہ عربی پشاور یونیورسٹی۔

(۳) "نماز ایک معجزہ" ص۵ پر ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس کا متن یہ ہے: "الصلوٰۃ عماد الدین فمن اقامھا اقام الدین ومن ترکھا فقد ھدم الدین۔"

اس حدیث کے ماخذ کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔ عجیب بات ہے کہ اردو زبان کے بعض بلند پایہ مصنفین نے بھی بغیر حوالے کے نقل فرما دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی حدیث ہی نہیں ہے۔ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ یہ روایت غیر معروف ہے:

قال ابن الصلاح فی مشکل الوسیط انہ غیر معروف۔

امام نووی نے تو اسے منکر اور باطل تک قرار دیا ہے: وقال النووی فی التنقیح انہ منکر باطل۔

گنتی کے یہ چند تسامحات کتاب کی صدہا خوبیوں کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ "نماز ایک معجزہ" مختصر ہونے کے باوجود نہایت بلند پایہ اور لائق مطالعہ ہے۔ ●●

محمد اسمٰعیل فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

فارغات کو نصیحتیں

۹ فروری ۱۹۹۹ء کو کلیۃ البنات (جامعۃ الفلاح) میں فارغ ہونے والی طالبات سے استاذ جامعہ مولانا ابو بکر صاحب اصلاحی سابق صدر و ناظم جامعہ نے فرمایا کہ مجھے خوشی و مسرت ہے کہ کلیۃ البنات نے ایک سال اور پورا کر لیا اور ایک گروپ فارغ ہونے جا رہا ہے۔ کسان جب اپنی فصل تیار دیکھتا ہے تو اسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ بلاشبہ ساتھ رہنے سے باہم انسیت و محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہماری بچیاں جو فارغ ہونے جا رہی ہیں اس سے ان لوگوں کو تکلیف ہونا ایک فطری امر ہے جن کے ساتھ ایک مدت گزری ہے جنھوں نے ان کو بنانے سنوارنے اور زیور علم سے آراستہ کرنے میں اپنا پسینہ بہایا ہے لیکن یہ دن آنا ہی تھا جو بچیاں تعلیم حاصل کرنے آتی ہیں بہرحال ان کی تعلیم ایک دن مکمل ہوگی اور انھیں جانا ہی ہوگا۔ اس موقع پر مولانا نے کچھ نصیحتیں بھی کیں۔ آپ نے کہا آپ کو تین حقوق ادا کرنے ہیں۔ پہلا حق تو آپ کا اپنا ہے۔ جو کچھ آپ نے سیکھا اور حاصل کیا ہے اس لئے سیکھا ہے کہ آپ سچی مومنہ و فاضلہ بنیں، آپ کا کردار ایک مومنہ کا کردار ہو جو کچھ آپ نے پڑھا ہے اگر اس کے مطابق آپ کا عمل ہو تو گویا آپ نے اپنا حق ادا کیا اس لئے اپنے آپ کو کتاب و سنت کے مطابق بنائیں، ڈھالیں اور سنواریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ دین کی یہ تعلیمات جن سے آپ آراستہ ہوئی ہیں دوسروں کے لئے بھی ویسی ہی مفید ہیں جیسی آپ کے لئے۔ آپ کا فرض ہے کہ ہمدردی و اخلاص کے ساتھ خاندان، عزیز و اقرباء اور پاس پڑوس میں اس دین کی تعلیمات کو عام کریں۔ اس راہ میں آپ کے کلام میں مٹھاس، شیرینی اور محبت ہونی چاہئے۔ شیریں کلامی وہ ہتھیار ہے جس سے ہر ایک کا دل جیتا جا سکتا ہے۔ جامعۃ الفلاح کا قیام اسی غرض کے لئے ہوا تھا کہ یہاں

سے فارغ کئے جائیں جو خود دین پر عامل ہوں اور دوسروں تک اسے پہنچانے والے ہوں اگر آپ نے اس میں غفلت برتی تو آپ نے اپنے آپ کو ٹھیس پہنچائی۔ آپ جہاں کہیں ہوں علم کی روشنی عام کریں۔ آپ کا مقام چراغ کا ہے، آپ کی حیثیت چاند کی ہے۔ چراغ جلے اور روشنی نہ ہو یہ ممکن نہیں۔

استاذ جامعہ جناب ماسٹر قاضی زین العابدین صاحب ریٹائرڈ پرنسپل گورنمنٹ اردو جونیئر کالج آف ایجوکیشن ابالا پور، ضلع اکولہ، مہاراشٹر نے خوشی و غم دونوں کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: خوشی اس بات کی ہے کہ آپ کو آپ کی محنت کا ثمرہ مل رہا ہے اور غم مفارقت کا ہے۔ جہاں رہیں اس مدرسہ کو فراموش نہ کریں۔ آپ کے سرپرستوں نے آپ کو اس لئے یہاں بھیجا تھا کہ علم حاصل کرنے کے بعد آپ اپنے علاقوں کو پُرنور کر دیں گی۔ خواتین مذہبی علوم سے بے بہرہ ہیں اس وجہ سے آپ پر بڑی ذمہ داری ہے۔ قوم کے سنہرے خواب کی تعبیر آپ ہیں۔ اپنے مطالعہ کو وسیع کیجئے اپنے اخلاق کو بنائیے سنواریئے۔ اللہ آپ سے اپنے دین کی خدمت لے۔

مولانا اعجاز احمد صاحب فلاحی نے بھی کچھ اسی طرح کے خیالات پیش کئے۔ وہ کہہ رہے تھے ہمارا مقصد اقامت دین ہے، ہماری تخلیق اسی کے لئے ہوئی ہے۔ یہاں مطالعہ ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کو اندلس سے کس طرح ختم کیا گیا تاکہ یہاں بھی وہی حربہ اپنایا جائے۔ ہمارے مدرسے الگ بنے ہوئے ہیں۔ آپ نے چند سال یہاں گزارے ہیں جو کچھ سیکھا ہے اس پر عمل بھی کرنا ہے اور دوسروں تک پہنچانا بھی ہے۔ اگر کسی قوم کی عورتیں صحیح راستے پر آجائیں اور اپنا فرض ادا کرنے لگیں تو انقلاب آسکتا ہے۔ موصوف نے اس حدیث پر اپنی بات ختم کی۔ لأن يهدي الله بك رجلا واحدا خير لك من حمر النعم۔ تمہارے ہاتھوں ایک شخص کو ہدایت مل جانا سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

جمعیۃ الطلبہ کی سرگرمیاں

پچھلے دو شماروں سے ہمارے قارئین جمعیت کے مقابلوں کی روداد پڑھ رہے ہیں۔ بقیہ تفصیل درج ذیل ہے:

اردو تحریری مقابلہ: عربی پنجم تا عربی ہفتم: I محمد انور خان گونڈوی عربی ششم بعنوان "قرآن اور دعوت انقلاب": II احسان اللہ گونڈوی عربی ششم

بعنوان "ہندوستان میں محدثین کی خدمات" III عبدالرحمن گونڈوی عربی ششم بعنوان "اسلام اور قادیانیت" اور عبدالاول بستوی عربی ہفتم بعنوان "ہندوستان میں محدثین کی خدمات"

کھیل :- پڑھائی کے لئے کھیل اور جسمانی ورزش ایک ضروری چیز ہے۔ صحت مند جسم میں ہی صحت مند دماغ ہو سکتا ہے اور صحت کے لئے کھیل اور ورزش ضروری شے ہے۔ صحت نہیں تو انسان نہ تو پڑھ سکتا نہ دین کے لئے بھاگ دوڑ کر سکتا اور نہ ہی کسی طرح کا کوئی نمایاں کام کر سکتا ہے۔ اس کا وجود خود اس کے اوپر ایک بوجھ بن جاتا ہے۔ غالب نے صحیح کہا ہے ؎ تنگ دستی گر نہ ہو غالبؔ ؛ تندرستی ہزار نعمت ہے۔

حضورؐ کا ارشاد ہے: المومن القوی خیر من المومن الضعیف۔ طاقتور مومن کمزور مومن سے بہتر ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ کے مشرف بہ اسلام ہونے سے اسلام کو جو توانائی ملی وہ کم ہی لوگوں سے مل سکی۔ یہی وجہ ہے کہ جامعہ نے طلبہ کے لئے کھیل کود کا باقاعدہ نظم کیا ہے اور اس کے لئے جمعیت کی طرف سے مقابلے بھی کرائے جاتے ہیں۔

فٹ بال میچ :- فٹ بال کے چار گروپ ہیں اور ہر گروپ میں تین تین ٹیمیں ہیں:

گروپ اے I الف ، II ب ، III ج ، کیپٹن: غلام سرور گیاوی عربی ششم، خالد آسامی عربی سوم ، عامر اصغر مدھوبنی عربی پنجم ، مین آف دی میچ عامر اصغر مدھوبنی عربی پنجم

گروپ بی I الف ، II ب ، III ج ، کیپٹن: اکرام الرحمن مدھوبنی عربی اول۔ نسیم احمد بہاری باغ عربی اول، تاج احمد جونپوری عربی سوم ، مین آف دی میچ: حمید اللہ سیوانی عربی اول۔

گروپ سی I الف ، II ب ، III ج ، کیپٹن ابوصالح گیاوی ہفتم ثانوی، نوشاد عالم گیاوی ہشتم ثانوی ، ریحان خالد ہشتم ثانوی۔ مین آف دی میچ نوشاد عالم گیاوی

گروپ ڈی I الف ، II ب ، III ج ، کیپٹن امتیاز احمد اعظمی پنجم ثانوی ، غلام سرور دربھنگوی درجہ حفظ ، منہاج الدین گیاوی ششم ثانوی ، مین آف دی میچ: جمیل الرحمن مدھوبنی درجہ حفظ ، مین آف دی سیریز محمد ابراہیم نیپالی عربی اول۔

والی بال میچ :- اس میں صرف ایک گروپ تھا جس میں چھ ٹیمیں تھیں۔

I الف ، II ب ، III ج ، کیپٹن محمد اعظم اعظمی عربی سوم ، عبدالرحمن اعظمی عربی پنجم ، اقبال احمد ندوی عربی سوم۔ مین آف دی میچ انصار فاروقی اعظمی عربی چہارم ، مین آف دی سیریز محمد اعظم اعظمی۔ عربی سوم۔

اس بار بھی شیلڈ جامعہ میں

میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور میں ہر سال سیرت پر تقریری، تحریری اور تجوید و نعت کے مقابلے ریاستی سطح پر کرائے جاتے ہیں۔ اس سال یہ مقابلہ ۲ اور ۳ فروری ۱۹۹۸ء کو گورکھپور میں ہوا جس میں کل بیس مدارس اور اسکولوں کے طلبہ نے حصہ لیا۔ جامعۃ الفلاح سے مولانا نعیم الدین صاحب اصلاحی کی سرپرستی میں طلبہ کا ایک گروپ میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور پہنچا اور گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی جامعہ کے طلبہ اول انعام کے مستحق قرار پائے اور شیلڈ جیت کر واپس آئے۔ عبدالمنان مبارکپوری عربی اول قرأت میں I ، ریحان بدر نینی تال ششم ثانوی نعت میں II ، نجم السحر ثاقب دربھنگوی درجہ حفظ بہ انداز تقریر میں حدیث پیش کرنے میں II اور سید ابوبکر صدیق حیدرآبادی عربی اول "موجودہ نسل اور تعلیمات نبوی" پر تقریر میں I آئے۔ اس موقع پر ایک مقابلہ تحریری بھی ہوتا ہے اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ شرکاء کو سوالنامہ دیا جاتا ہے اور اسے حل کرنا ہوتا ہے۔ اس دفعہ سوالات حضور کی مکی زندگی سے متعلق تھے محمد الدین غازی اعظمی عربی دوم نے اس میں I پوزیشن حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی صلاحیتوں کو اور جلا بخشے۔

انجمن کی طرف سے انعام

طلبہ کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور ان کے اندر حوصلہ پیدا کرنے کے لیے انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کی طرف سے گاہے گاہے طلبہ کو انعامات دیئے جاتے رہے ہیں۔ فروری ۹۸ء کے شمارے میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ عربی پنجم ، عربی ششم اور عربی ہفتم سے قرآن میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے طالب علم کو اور شعبۂ نسواں ، عالمیت چہارم و فاضلہ اخری سے قرآن میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والی طالبہ کو مختصر تفسیر ابن کثیر کا مکمل سیٹ بطور انعام دیا جائے گا۔ ہمیں خوشی ہے کہ عبدالرزاق دربھنگوی عربی ہشتم نے اور بہن خورشید جبین عثمانی اعظمی عالمیت چہارم نے سب سے زیادہ قرآن میں نمبر حاصل کئے۔ ہم دونوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ جاوید اشرف فلاحی صاحب نے انجمن کی طرف سے مختصر تفسیر ابن کثیر بطور انعام پیش کی۔

مولانا نور محمد صاحب فلاحی کی واپسی

قارئین کے علم میں یہ بات ہوگی کہ جامعہ [illegible] مدیر مسئول اور استاذ جامعہ مولانا نور محمد صاحب فلاحی ستمبر ۸۸ء میں تربیت معلمین (ٹیچر ٹریننگ) کیلئے جامعۃ الملک سعود (ریاض) گئے تھے۔ موصوف [illegible] ۸۹ء کو جامعہ واپس آگئے ہیں اور یہاں دوبارہ جامعہ کی تدریسی ذمہ داریوں میں مصروف ہیں۔ ہم انہیں مبارکباد دیتے ہیں کہ الحمد للہ انھوں نے اپنے درجہ میں نمایاں کامیابی حاصل کی وہاں پر دنیا کے مختلف ممالک کے اساتذہ سے ملاقات کی [3] جن سے جامعۃ الفلاح اور اسکے نصاب سے متعلق باتیں ہوئیں۔ لوگوں نے اس کی [illegible] بلکہ بعضوں نے نصاب طلب بھی کیا۔ مولانا نور محمد صاحب فلاحی سے معلوم ہوا کہ یہ دورہ اساتذہ کیلئے مفید ہے کیونکہ وہ شعبہ خاص طور پر عربی زبان سیکھنے اور بولنے پڑھنے کے وسائل و ذرائع کو طریقہ تدریس میں استعمال کرنے پر زور دیتا ہے۔ اساتذہ اپنے فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ تھوڑے سے وقت میں [illegible] کے اندر زیادہ سے زیادہ صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کے ریاض سے روانہ ہونے سے پہلے بروز [illegible] جناب سید عالم صاحب فلاحی کے گھر عشائیہ کا پروگرام رکھا گیا تھا جس میں ریاض میں مقیم تمام فلاحی حضرات شریک ہوئے وہاں پر جامعہ اور [illegible] کے مختلف مسائل زیر بحث آئے۔ سبھی نے اپنی ہمدردیوں کا اظہار کیا اور حتی الامکان تعاون کا وعدہ کیا۔ ان فلاحی بھائیوں نے اپنی اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ آخری درجہ کے طلبہ کو عربی و انگلش ٹائپ ضرور سکھا دیا جائے یہ وقت کا تقاضا ہے۔ انھوں نے کہا جامعہ یہ کام کرے تو بہتر ہے اور اگر کسی وجہ سے جامعہ اسکی طرف توجہ نہ دے تو انجمن طلبہ قدیم ہی اس کی طرف متوجہ ہو۔ انشاء اللہ وہ لوگ ٹائپ [illegible] مختلف قسطوں میں فراہم کرنے کی کوشش کریں گے۔

تعمیرات

جگہ کی تنگی اور طلبہ کی کثرت کی بنا پر جامعہ میں تعمیرات کا سلسلہ جاری ہے۔ گذشتہ چند مہینوں میں دو منزلہ کی دوسری منزل کے کمروں کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے جنہیں تعلیم بھی ہو رہی ہے۔ بعض کمروں کے پلاسٹر بھی کرائے گئے ہیں البتہ دوسری منزل کے سائبان کی تعمیر جاری ہے دوسری جانب کنٹین کے قریب بارہ استنجا خانے بھی تعمیر ہوئے ہیں اسی اثناء میں درسگاہ کے سامنے والے میدان میں جو کھیت تھا اور نشیب میں تھا۔ ہزاروں ٹرالی مٹی ڈالکر اس کی سطح بلند کی گئی ہے۔

انتظامیہ کا اجلاس

۳۰ اور ۳۱ مارچ ۸۹ء کو معمول کے مطابق جامعہ کی انتظامیہ کا سالانہ اجلاس جامعہ میں ہونا پایا ہے جس میں بجٹ اور دیگر امور زیر بحث آئیں گے۔

غزل

عہد گل اس طرح کا شاید کبھی آیا نہ تھا
پیڑ تو موجود تھے لیکن کوئی سایہ نہ تھا

آگ کے شعلے دھواں جلتے مکانوں کی لویں
شہر میں ان کے علاوہ کچھ نظر آیا نہ تھا

میں لئے پھرتا تھا جس کو زندگی کی بھیڑ میں
وہ انا تھی میری کوئی اور سرمایہ نہ تھا

نفرتوں کی آگ سے چہرے ہوئے بے رنگ و آب
ورنہ گلشن میں کوئی بھی پھول مرجھایا نہ تھا

ساری بستی ساتھ میرے تھی غموں کی دھوپ میں
ہاں شریک غم نہ تھا تو میرا ہمسایہ نہ تھا

ہو گئے تعمیر در و اقسے بہت دیوار میں گم
ہم نے اپنے گھر کا نقشہ ایسا تو بنوایا نہ تھا

عمر بھر جلتا رہا احساس کے شعلوں میں جو
آگہی کے شہر میں وہ شخص بے مایہ نہ تھا

کر گئی جب گھر دلوں میں جذبۂ مہر و خلوص
آ گئے وہ پاس میرے میں نے بلوایا نہ تھا

کرب آہیں زخم دل سوز جگر خون و وفا
زندگی میں ہم نے کچھ ان کے سوا پایا نہ تھا

آج بھی تاریخ کے صفحات ہیں اس کے گواہ
ظلم کی چوکھٹ پہ ہم نے ہاتھ پھیلایا نہ تھا

قوم نے بخشا ہے اسے فائق قیادت کا علم
رزمگاہ علم و فن میں جو کبھی آیا نہ تھا

فائق انصاری اصلوی